اُردو کی سَپلی

تنقیدی و تخلیقی طرزِ فکر کی آبیاری کے لیے لازمی پرچہ

ڈاکٹر عون علی

اُردو کی سَپلی

ڈاکٹر عون علی

ایک ہاتھ سے تالی کیسے بجی؟
منہ سے مرغی کیوں نکلی؟
مچھلیاں پانی میں کیسے ڈوبیں؟
مرغے نے منطق کیوں پڑھی؟
پانچ کونوں والی کون تھی؟
دسواں جوتا کہاں گیا؟
گورکھ دھندا آخر کیا تھا؟
یہ سب کچھ
اور بہت کچھ

جانیے
بوجھیے
حل کیجیے!
آج ہی پڑھیے
اُردو کی سَپلی!
تنقیدی و تخلیقی طرز فکر کی آبیاری کے لیے
لازمی پرچہ!

Urdu Ki Sapli By Dr. Aun Ali

www.aynbooks.org
ISBN 978-1-998355-01-3
(Free Online Edition)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی سَپلی

تنقیدی و تخلیقی طرزِ فکر کی آبیاری کے لیے لازمی پرچہ

(اسباق و امتحانی سوالات)

ڈاکٹر عون علی

Ayn Books

ترتیب

حصّہ اول

حصّہ دوم

حصّہ سوم

اپنے تمام اساتذہ کے نام!

حصّہ اول

نئی تازی[۱]

(گفتگو اور اِبلاغ کا فن)

اور سناؤ، کوئی نئی تازی؟

تم نے وہ ہیڈ لائن پڑھی؟

کونسی ہیڈ لائن؟

ارے وہی کہ گلگت میں ایک شخص کے منہ سے مرغی نکلی!

ھیں ں ں--- مرغی نکلی؟

ہاں-- وہ شخص مُرغ قورمہ کھا رہا تھا۔ حلق میں کچھ محسوس ہوا۔ منہ میں ہاتھ ڈالا تو پوری مرغی باہر نکل آئی!

زندہ مرغی---؟

نہیں، زندہ تو نہیں تھی۔ اصل میں مرغی بھی نہیں تھی۔ وہ تو گلگت سے نیچے کراچی آتے آتے مرغی بن گئی۔

کراچی آتے آتے؟ وہ مرغی کراچی بھی آئی تھی؟

نہیں نہیں، اُس کی صرف خبر یہاں پہنچی تھی۔ کراچی سے اوپر سکھر میں جب اُس شخص نے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا تو مرغی کا صرف سر، گردن، اور سینہ نکلا تھا۔

پوری مرغی نہیں---؟

[۱] ایک مشہور لوک کہانی کو یہاں عصری تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

نہیں، پوری مرغی نہیں۔ اور اس سے اوپر لاہور میں جب اس شخص نے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا تو صرف سر اور گردن نکلی تھی۔

آدھی مرغی بھی نہیں۔۔۔؟

نہیں، آدھی مرغی بھی نہیں۔ اور اس سے اوپر پنڈی میں جب اس شخص نے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا تو صرف سر نکلا تھا۔

صرف سر۔۔۔؟

ہاں، اور اس سے اوپر گلگت میں جب اس شخص نے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا تو مرغی کا صرف پَر نکلا تھا۔

صرف پَر نکلا تھا۔۔۔ اور وہ پَر گلگت سے کراچی پہنچتے پہنچتے پوری مرغی بن گیا!

ہاں، اصل بات تو یہی ہے۔ لیکن صرف پَر نکلنے پر تو ہیڈ لائن نہیں بنتی ہے نا۔ خبر بھی مرغ قورمے کی طرح ہو تو ہی مزا آتا ہے۔ نہ ہو تو لوگ خود مرغ قورمہ بنا لیتے ہیں!

ہاں، بات تو صحیح کہہ رہے ہو۔ صرف مرغی کا پَر ہوتا تو میں بھی اتنی دلچسپی نہ لیتا۔ بس ہیڈ لائن پڑھ کر دوسری خبر پر چلا جاتا۔ ویسے مزے کی ہیڈ لائن تھی۔۔۔ اور کوئی نئی تازی؟

آگے جانا ہے!

(اسم ضمیر کا قاعدہ)

میں نے جانا ہے!

تم نے جانا ہے!

اُس نے جانا ہے!

ہاں ں ں--- ہم سب نے جانا ہے!

آگے جانا ہے!

آگے جانا ہے!

ارے بیٹا، نعرے لگاتے ہوئے کہاں جا رہے ہو؟

ماسٹر جی، چوک پر جلسہ ہو رہا ہے۔

اچھا--- مگر تم کیوں جا رہے ہو؟

ماسٹر جی، اس لیے کہ آگے جانا ہے۔

مگر بیٹا، پچھلوں نے بھی تو یہی نعرے لگائے تھے کہ نہیں؟

جی ماسٹر جی۔

تو بیٹا، صرف یہ کہنا تو کافی نہیں کہ آگے جانا ہے،

یہ بھی بتاؤ، کس سمت میں جانا ہے، کیسے جانا ہے، کہاں تک جانا ہے،

اور جب دوسروں نے یہی نعرے لگائے تھے، وہ کیوں آگے نہیں جا سکے۔

ماسٹر جی، اتنا سب تو پتا نہیں، لیکن آگے جانا ہے۔

چلو آج جلسے میں جاؤ تو پتا کر کے آنا!

جی ماسٹر جی!

ماسٹر جی!

ہاں کہو بیٹا!

ماسٹر جی، آپ نے آگے نہیں جانا ہے؟

ہاں بیٹا، کیوں نہیں جانا ہے،

لیکن تجزیے کے بغیر میدانِ عمل میں کیسے کودا جا سکتا ہے۔

یہ تجزیہ کیا ہوتا ہے، ماسٹر جی؟

ہاں ں ں، تجزیہ یعنی آنکھیں کُھلی رکھنا،

نعروں کے پیچھے اصل بات کیا ہے، وہ سمجھنا،

ماضی میں جا کر سِروں کو تلاش کرنا،

تاریخ کی مختلف تعبیرات کو تنقید کے ترازو میں تولنا،

اور خود اپنی تنقید کو بھی زیر بحث لانا،

تب کہیں جا کر تجزیہ ہوتا ہے،

اور درست لائحۂ عمل اور میدانِ عمل بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

اور ہاں، یہ بھی سوچنا ہوتا ہے کہ عمل درآمد کون کرے گا۔

ماسٹر جی!

ہاں بیٹا!

ماسٹر جی، اتنا سب سوچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟

بیٹا، اس میں وقت تو لگتا ہے،

کوئی ضمیر کا سودا تو نہیں کرنا۔

پھر نوکری، بال بچّے، یہ سب ذمّہ داریاں بھی ہوتی ہیں۔

ماسٹر جی، بیچ میں قوم کا کیا ہوگا؟

ہاں ں ں، یہ سوال بھی اہم ہے، اس پر بھی سوچنا ضروری ہے۔

ٹھیک ہے ماسٹر جی، آپ سوچ لیں تو بتا دیجیے گا، میں چلوں جلسے کے لیے؟

ہاں بیٹا، خیریت سے جاؤ!

جی ماسٹر جی!

میں نے جانا ہے!

تم نے جانا ہے!

اس نے جانا ہے!

ہاں ں ں--- ہم سب نے جانا ہے!

آگے جانا ہے!

آگے جانا ہے!

بخدمت جناب!
(عرضی لکھنے کے آداب)

ہاں بچّو، تیار ہو---؟

ہاں لکھو!

بخدمت جنابِ ڈپٹی کمشنر صاحِب---

ویسے بچّو، ممکن ہے یہاں انشا کے بعض اساتذہ کہیں کہ اگر شروع میں 'جناب' لکھ دیا ہے تو آخر میں 'صاحِب' لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بلکہ دونوں کو یوں لکھنے کو معیوب قرار دیں اور اصرار کریں کہ یا 'جناب' لکھو یا 'صاحِب'۔ لیکن بچّو، یاد رکھو اس مقام پر ادب آداب کا اظہار مقصود ہے۔ پڑھنے والے کو اپنے خلوص سے متاثر کرنا ہے۔ اس لیے اُسلوب انتہائی مؤدّبانہ ہونا چاہیے۔ بلکہ پوری عرضی ایسے لکھنی چاہیے کہ جیسے ہم سرکار کے قدموں کی دُھول ہیں اور عرضی تو بس اک بہانہ ہے ورنہ سرکار کی صحت و سلامتی اور خوشنودی ہی اصل مقصد ہے۔ سو ذہن نشین کر لو کہ ہمیشہ جامع القاب و آداب کے ساتھ مخاطب کرو اور پختہ عادت بنا لو کہ 'جناب' کے ساتھ 'صاحِب' ضرور لکھو۔ ایسی پختہ عادت کہ اگر نہ لکھو تو خالی خالی سا لگے۔

کیا، کیا کہا---؟

اگر انشا کے اساتذہ معیوب سمجھتے ہیں تو 'صاحِب' نہ لکھیں---؟

شرافت میاں! جوتے کو پاؤں میں پہنا جاتا ہے، پاؤں کو جوتے میں نہیں! زبان تہذیب و آداب کے اظہار کے لیے ہوتی ہے۔ زبان کے لیے تہذیب و آداب کو نہیں بگاڑا جاتا۔

عرضی لکھنے کے اپنے آداب ہیں، ان کا خیال رکھو گے تو مہذّب دکھائی دو گے۔ پتا چلے گا کہ درخواست گزار نے صرف الف ب پڑھنا نہیں سیکھا، تہذیب و آداب سے بھی بہرہ مند ہے۔ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

اور میاں، تم سے یہ ادب آداب نوابوں کے دربار سے نہیں سیکھے جاتے تو انگریزوں سے ہی سیکھ لو!

وہ انگریزی میں کیا لکھتے ہیں:

With due respect... I... I...

ہاں جملہ مکمل کرو، سب کہو آگے کیا لکھتے ہیں---

آں ں ں!

With due respect, I beg to state that...

کیا بات، کیا بات ہے---!

سب پھر سے کہو!

واہ واہ! ہاں بچھے جاؤ، بچھے جاؤ! حق بھی مانگ رہے ہو تو ایسے مانگو جیسے خیرات مانگ رہے ہو۔ یہی لہجہ، یہی ادب عرضی میں روح پھونکتے ہیں!

ارے قدر کرو! قدر کرو ان آداب کی! مت بھولو کہ انگریزوں کو اتنے سال ہم پر حکمرانی کرنی پڑی، دہلی دربار لگانے پڑے، براؤن صاحبوں کی تربیت کرنی پڑی، تب جا کر یہ آداب ہم تک پہنچے۔ قدر کرو!

ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا---؟

ہاں، جامع القاب و آداب کے ساتھ سرکار کو مخاطب کرو، چاہے گورا صاحِب ہو یا براؤن صاحِب۔ مثلاً ان کو مخاطب کرتے ہوئے لکھو: جنابِ عالی، عزت مآب، یا آنریبل!

اور جب عرضی کے خاتمے پر اپنا نام لکھنے لگو تو پہلے لازماً لکھو: بندہ ناچیز، اَحقَر، خادم، یا اسی طرح کا کوئی اور موزوں لقب! اور اَحقَر تو اپنے لیے بڑا ہی موزوں لقب ہے۔ اَحقَر یعنی چھوٹا، پست درجے کا، حقیر، بے وجود سا!

یہ تو تھا عرضی کا آغاز اور خاتمہ۔ اور بچّو، جب نفسِ مضمون لکھ رہے ہو، وہاں بھی مت بھلانا کہ عرضی یوں پیش کی جائے جیسے حق نہیں مانگ رہے ہو، سرکار کا احسان لے رہے ہو۔ خبردار جو ایسی کوئی بات لکھی کہ وہ عوام کے خادم ہیں یا شہری امور کی دیکھ بھال ان کا فرض ہے۔ اس نظام کا اپنا مزاج ہے۔ عرضی لکھتے ہوئے اس کا لحاظ کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اور احسان مند ہونا ویسے بھی اچھی صفت ہے۔ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ نہیں؟

ہاں اور جب نفسِ مضمون مکمل کر چکو تو ضرور لکھنا کہ عین نوازش ہوگی، آپ کی عنایت کا منتظر ہوں، میں آپ کا تابع فرمان ہوں، یا بندہ عمر بھر احسان مند رہے گا!

سمجھے، یہ ہیں عرضی لکھنے کا لہجہ اور آداب!

اب واپس آؤ، کیا لکھا تھا---؟

ہاں--- بخدمت جنابِ ڈپٹی کمشنر صاحِب---

کیا؟ کیا کہہ رہے ہو، شرافت میاں---؟

کیا کہا، ہم خطوطِ غالب کی طرز پر کیوں نہیں لکھ سکتے؟ ان سارے تکلّفات میں پڑے بغیر---؟

شرافت میاں، آج گھاس کھا کر تو نہیں آئے ہو---؟

ہُنھ، عرضی نہ ہوئی، سوشل میڈیا ہوگیا! تکلفات میں پڑے بغیر لکھیں گے، برخوردار!

میاں، غالب کے دو ایک خط نصاب میں کیا پڑھ لیے اب اپنے استاد کو سبق پڑھاؤ گے۔ کبھی غالب کی عرضیاں بھی پڑھ ڈالو! سارے تکلّفات ایک دوسرے کے اوپر لدے مل جائیں گے!

ہائے ہائے، قسمت بھی کیا دن دکھاتی ہے! ارے غالب ہی سے کچھ سبق سیکھ لو! یوں مفلوک الحال تو نہ مرتے اگر ذرا اور دل لگا کر عرضیاں لکھتے۔ اگر ذرا اور گردن جھکا کر کورنش بجا لاتے۔ ارے جنازہ تو ڈھنگ سے اٹھتا!

شرافت میاں، تم کسی اور کو نہیں اپنے بھائی لیاقت کو دیکھ لو! میٹرک تک غالب کو 'گ' سے لکھتا رہا۔ لیکن بڑا ہی با ادب بچّہ ہے۔ بڑوں کا احترام کرتا ہے۔ حفظِ مراتب کا لحاظ کرنا اچھی طرح جانتا ہے۔ اب دیکھو، محکمہِ تعلیم میں لگ گیا ہے۔ نوکری لگتے ہی سیدھا مٹھائی لے کر آیا تھا!

تم سب میری بات کان کھول کر سن لو! اگر ان آداب کو نہ سیکھا تو تمہاری تعلیم کا کوئی فائدہ نہ ہوگا! پوری زندگی سرکاری دفتروں کے چکر کاٹتے رہو گے!

ہاں امتیاز، کیا کہہ رہے ہو---؟

ہاں میاں، میں بھی تو ایک گھنٹے سے یہی بات سمجھا رہا ہوں کہ صحتِ املا، گرامر، انشا کے قواعد وغیرہ، یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔ بنیادی بات عرضی لکھنے والے کا لہجہ اور آداب ہیں۔ ورنہ صرف کاغذ پر عرضی لکھنے سے کب کام ہوتا ہے، ہاں---؟

عرضی کا کام تو یہ ہے کہ سرکار کو پتا چلے کہ بندہ باتمیز ہے۔ رکھ رکھاؤ جانتا ہے۔ بات سمجھانی نہیں پڑے گی۔ باقی اصل مسئلہ تو باہمی تعاون سے حل کیا جاتا ہے۔ سمجھے کہ نہیں---؟

ارے سمجھ لو! تم لوگ اچھی طرح سمجھ لو! یہ گُر کتابیں پڑھنے سے نہیں ملتے ہیں، زندگی کے تجربے سکھاتے ہیں۔ جوتیاں گِھستی ہیں، جوانی کے سارے گھمنڈ نکلتے ہیں، تب کہیں جا کر سمجھ میں آتے ہیں!

سن رہے ہو کہ نہیں! تم لوگوں نے دس سال یہاں اسکول میں بیٹھ کر صرف کرسیاں توڑی ہیں۔ نہ اسکول نے تمہیں کچھ سکھایا نہ تم نے کچھ سیکھا۔ کم از کم ڈھنگ سے عرضی لکھنا ہی سیکھ لو تا کہ کسی سرکاری دفتر میں کوئی کرسی توڑنے کو مل جائے۔ کچھ اور نہیں تو کسی سرکاری اسکول میں ٹیچر ہی لگ جاؤ۔ یہاں بھی توڑنے کے لیے بہت کرسیاں ہوتی ہیں!

ہاں اب لکھو۔۔۔ اور خبردار جو کوئی بیچ میں بولا!

ہاں لکھو!

بخدمت جنابِ ڈپٹی کمشنر صاحِب۔۔۔

دسواں جوتا

(ضرب کا قاعدہ)

ایک جوڑے میں--- دو جوتے

دو جوڑوں میں--- چار جوتے

تین جوڑوں میں--- چھ جوتے

چار جوڑوں میں--- آٹھ جوتے

پانچ جوڑوں میں ---

ارے، پانچوے جوڑے میں تو صرف ایک جوتا ہے؟

دسواں جوتا کہاں گیا---؟

ہاں ڈھونڈو--- تلاش کرو!

ہاں اُدھر بھی دیکھو!

اچانک نواں جوتا بولا

سنیں!

آپ نے لمبی لائن لگوانی تھی

اور لمبی گنتی کروانی تھی

دسویں جوتے سے باری کا انتظار نہ ہوا

اس لیے وہ چل دیا

لیکن ہم تو یہیں ہیں

ہمیں تو گِن لیں

آگے دوسری لائن میں بھی لگنا ہے۔

سب بِکوا لو!

(جدید معاشیات کا ایک سبق)

سب بِکوا لو! سب بِکوا لو!

یہاں سب بِکتا ہے!

معیشت کا پہیا چلتا ہے!

سب بِکوا لو! سب بِکوا لو!

میڈم، آپ نے کچھ بِکوانا ہے؟

سر جی، آپ نے کچھ بِکوانا ہے؟

مولانا صاحب، آپ نے کچھ بِکوانا ہے؟

او پُتر، کیا بیچ رہے ہو؟

کچھ نہیں، چاچا جی۔

تو یہاں چوک پر کھڑے کیوں چِلاّ رہے ہو؟

چاچا جی، میں ایجنٹ ہوں۔

ھیں ں ں۔۔۔ تم ایجنٹ ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟

نہیں چاچا جی، وہ والا نہیں، اشتہارات والا ایجنٹ ہوں، میں اپنے صاحب کے لیے اشتہارات جمع کرتا ہوں۔

یہ تمہارا صاحب کون ہے؟

چاچا جی، وہ سوشل اِنفلوئنسر ہے۔

پتر ذرا اونچا بولو! مجھے کم سنائی دیتا ہے۔

چاچا جی، وہ سوشل اِنفلوئنسر ہے!

سوشل اِنفلوئنزا، یہ کونسی نئی بیماری ہے؟

سوشل اِنفلوئنزا نہیں، چاچا جی، سوشل اِنفلوئنسر! میرا صاحب مشہور آدمی ہے۔ لوگ اس کو پسند کرتے ہیں، اس کی بات سنتے ہیں۔

لوگ اُس کی بات سنتے ہیں، تو اچھے کام کرے، اچھی باتیں کرے، یہ منجن بیچنا کیوں شروع کر دیا ہے؟

چاچا جی، یہ بھی اچھا کام ہی ہے۔ بازار میں اتنی ساری چیزیں ملتی ہیں، انتخاب کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میرا صاحب لوگوں کو بتاتا ہے کونسا صابن، کونسا شیمپو، کونسی چائے، کونسا دودھ لینا ہے۔ مارکیٹ میں کون کونسی چیزیں نئی آئی ہیں۔ کِن کِن کا فیشن گزر گیا ہے۔

پتر، لوگ پہلے بھی تو چیزیں خریدتے تھے۔ خود پرکھتے تھے کہ چیز اچھی ہے، کارآمد ہے، پائیدار ہے۔ جتنی ضرورت ہوتی تھی اتنا ہی لیتے تھے۔ کسان، تاجر، دکاندار، سب سے علیک سلیک رکھتے تھے۔ دیکھتے تھے کہ دیانت دار ہے، خالص چیز دیتا ہے، مزدور کو جائز اجرت دیتا ہے، جانور پر ظلم نہیں کرتا ہے۔ غلط کام ہوتا دیکھتے تو فوراً منہ پر کہہ دیتے تھے۔

نہیں چاچا جی، پہلے بھی لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی میں چیزیں لیتے تھے۔ اب میرے صاحب کو دیکھ کر لیتے ہیں۔ اور چاچا جی، اب تو زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب میرا صاحب نہ ہو تو بڑی مشکل ہو جائے۔

ھیں ں --- وہ کیوں، پتر؟

چاچا جی، اب گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ اب دنیا کے ایک حصّے میں کپاس اُگتی ہے، دوسرے میں دھاگا بنتا ہے، تیسرے میں کپڑا بنتا ہے، چوتھے میں ریڈی میڈ لباس تیار ہوتا ہے، اور پانچوے میں بِکتا ہے۔ کچھ یہی حال چاکلیٹ، دودھ، چائے، موبائل فون وغیرہ کا ہے۔ اب کسے معلوم پیچھے کیا کہانی ہے، کیسے کوئی چیز بنتی ہے، کس کو کتنی اجرت ملتی ہے، کتنے جانوروں پر ظلم ہوتا ہے، کتنے دریا آلودہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کو یہ پوری تصویر دکھائی نہیں دیتی ہے۔ انھیں تو بس میرے صاحب کا ہنستا گاتا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ میرا صاحب ہنستے گاتے ہوئے ایک چیز کو استعمال کرتا ہے تو لوگ بھی وہ چیز خرید لیتے ہیں۔

ھیں ں ں پتر--- یہ تو فریب ہوا!

چاچا جی، یہاں فریب سے زیادہ خود فریبی ہے۔ اب کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ جا کر دیکھے پیچھے کیا ہوتا ہے۔ یا معلوم کرے کہ میرا صاحب وہ اشتہار والا سستا شیمپو استعمال بھی کرتا ہے یا نہیں۔ اور لوگوں کو بھی پتا ہوتا ہے کہ اشتہار میں میرا صاحب جھوٹ موٹ کا ناٹک کرتا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ بیچنا ہو تو ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہن لیتا ہے۔ کریڈٹ کارڈ بیچنا ہو تو ٹائی لگا کر بینک منیجر بن جاتا ہے۔ اینٹی ڈینڈرف شیمپو بیچنا ہو تو چمکدار سوٹ پہن کر پائلٹ بن جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ فریب بُرا لگتا تو شور نہ مچاتے! چاچا جی، اصل میں ہر ایک کے اندر خلا ہوتا ہے۔ ضرورتیں ہوتی ہیں، محرومیاں ہوتی ہیں، ڈھیر ساری آرزوئیں ہوتی ہیں۔ لوگ خود اپنے آپ کو فریب میں ڈالتے ہیں کہ شاید ان کے اندر کا خلا میرے صاحب کا ہنستا گاتا چہرہ دیکھ کر اور چیزیں خرید خرید کر پُر ہو جائے!

لیکن پتر، تمھارے صاحب کی بھی کوئی ذمّہ داری ہے کہ نہیں؟ لوگوں کو عقل دلائے؟ 'پوری تصویر' میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دکھائے؟

چاچا جی، آج کل ذمّہ داری کی بات کون کرتا ہے۔ چوئس کی بات کریں چوئس کی! اب چوئس کا زمانہ ہے۔ کوئی چیز لینی ہے تو لیں، نہیں لینی تو نہ لیں، لیکن دوسرے کی چوئس پر تنقید نہ کریں۔ چاچا جی، اگر لوگ آنکھیں بند رکھ کر چیزیں نہ خریدیں تو عالمی معیشت کا پہیّا کیسے چلے گا!

ھیں ں ں، پیچھے ساری دنیا کا بیڑا غرق ہو جائے، تمھارے صاحب کو اس کی پروا نہیں؟

چاچا جی، بات کو سمجھیں! ایک طرف عالمی معیشت ہے جس کا پہیّا چلنا ہے اور دوسرے طرف اربوں لوگ ہیں جن کی ضرورتوں اور خواہشوں کو پورا ہونا ہے۔ میرا صاحب تو درمیان میں بس میسنجر کا کام کرتا ہے!

کیا کرتا ہے، پتر؟

چاچا جی، میسنجر کا کام! پیغام پہچانے کا!

لیکن پتر، تمھارا صاحب اشتہار میں صرف پیغام تو نہیں پہنچاتا ہے۔ وہ تو ہنستے ہوئے گاتے ہوئے ہَوَس کی آگ کو بھڑکاتا ہے۔ لوگوں کو چیزیں جمع کرنے کی دوڑ میں لگاتا ہے۔ اُن کا بھی بیڑا غرق کرتا ہے۔

نہیں، چاچا جی، بات کو سمجھیں! میرا صاحب ایک پروفیشنل ہے۔ آپ کو رنگ گورا کرنے والی کریم کا اشتہار کروانا ہو، وہ شوق سے کرے گا۔ گوری رنگت کے کمپلیکس پر مفاد عامّہ کا اشتہار چلانا ہو، وہ بھی شوق سے کرے گا۔ آپ کو چپس، چاکلیٹ، جوس، مارجرین کا اشتہار کروانا ہو، وہ شوق سے کرے گا۔ بچّوں میں بڑھتے ہوئے موٹاپے اور ذیابیطس پر پیغام دلوانا ہو، وہ بھی شوق سے کرے گا۔ ماہِ رمضان میں بچکانہ گیم شو کروانا ہو یا چیزوں کی نُمود و نُمائش کروانی ہو، وہ بھی کرے گا۔ افطار سے پہلے قناعت و سادگی پر وعظ دلوانا ہو، وہ بھی

کرے گا۔ چاہے کیسا بھی اشتہار ہو، ٹی وی پروگرام ہو، سوشل کیمپین ہو، جیسا لوگ چاہیں گے میرا صاحب ویسا ہی کرے گا۔ کیونکہ چاچا جی، وہ ایک پروفیشنل ہے!

یعنی پتر، اُس کا اپنا کوئی دین ایمان نہیں ہے؟

چچ۔۔۔ چاچا جی، شہرت کے چند سال ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کوشش کرتا ہے کچھ کما لے، آگے کے لیے کچھ جمع کر لے۔میرا صاحب اشتہار نہیں کرے گا تو کوئی اور کر دے گا۔ یہاں لوگوں کی کمی تو نہیں۔ اور میرا صاحب تو ہر مہینے نادار بچّوں کی فیس بھی دیتا ہے۔ غریبوں میں راشن بھی بانٹتا ہے۔ ایک فلاحی ادارہ بھی بنایا ہوا ہے۔

ھیں ں ں، یعنی تمہارا صاحب پروفیشنل ہو کر بھی انسان ہے، عجیب بات ہے!

بس چاچا جی، اس کا فیصلہ تو اوپر والی ذات کرے گی۔ آپ بتائیں آپ نے کوئی چیز بِکوانی ہے؟

نہیں پتر، نیند کی گولی لینے نکلا تھا، اب خیال آ رہا ہے کہ گولی کی ضرورت نہیں، تمہارے صاحب کا اشتہار دیکھ لوں، وہی کافی رہے گا!

ہا ہا ہا، چاچا جی، یہ بھی خوب کہی!

پتر، تم اور کیا کرتے ہو؟

چاچا جی، میں نے سوسیولوجی میں گریجویشن کیا ہے۔ ڈھنگ کی نوکری نہیں ملی۔ اب صاحب کے لیے کمیشن پر کام کرتا ہوں۔

ھوں ں ں۔۔۔ یعنی تم بھی 'پروفیشنل' بن گئے!

جی چاچا جی، صحیح سمجھے! میں بھی 'پروفیشنل' بن گیا!

پتر، میں چلتا ہوں۔ اور وقت لیا تو تمہاری معیشت کا پہیا کہیں سست نہ پڑ جائے!

ہا ہا ہا۔۔۔ یہ بھی خوب کہی!

چاچا جی---!

ہاں پتر---؟

چاچا جی، وقت نے 'پروفیشنل' بنا دیا ہے، دعا کریں پھر سے انسان بن جاؤں!

پتر--- خدا تمہاری مدد کرے!

شکریہ، چاچا جی!

سب بِکوا لو! سب بِکوا لو!

یہاں سب بِکتا ہے!

معیشت کا پہیا چلتا ہے!

سب بِکوا لو! سب بِکوا لو!

پورا انسان

(ذخیرہ الفاظ - انسانی پیشے)

یہ نانبائی ہے۔ یہ نان پکاتا ہے۔

یہ بڑھئی ہے۔ یہ میز بناتا ہے۔

یہ کسان ہے۔ یہ غلّہ اگاتا ہے۔

یہ استانی ہے۔ یہ سبق پڑھاتی ہے۔

یہ---

ارے ارے، رکو بھئی! کیا دوڑے چلے جا رہے ہو؟

جی سر---؟

اس نانبائی کے بارے میں کچھ اور بھی تو بتاؤ!

جی سر---؟

بھئی یہ کہ اس کا نام کیا ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ کہاں رہتا ہے۔ اور کیا کیا کرتا ہے۔

سر--- یہ سب تو سبق میں نہیں لکھا ہوا۔

سبق میں نہیں لکھا ہوا تو کیا ہوا، ذرا خود بھی تو غور کرو!

جی سر---؟

اچھا بتاؤ، یہ جو نانبائی ہے، ہر وقت نان ہی پکاتا رہتا ہے؟ کبھی گھر بھی تو جاتا ہوگا؟

جی سر۔

کیا گھر میں بھی نان پکاتا رہتا ہے؟

جی نہیں، سر۔

ہاں تو اس نانبائی کے پیچھے ایک پورا انسان ہے جو ہر وقت نان ہی نہیں پکاتا رہتا۔ اس پورے انسان کو بھی دیکھنے کی کوشش کرو۔ پورے انسان کو دیکھو گے تو امکان ہے پوری قدر کرو گے۔ زندگی کے تجربے کو بھی بہتر سمجھ سکو گے۔ انسان کو ادھورا دیکھو گے تو برتاؤ بھی ادھورا ادھورا سا ہی کرو گے۔

جی سر--- لیکن---؟

لیکن؟

سر، آپ سے پہلے والے سر تو سیدھا سیدھا سبق سنتے تھے۔ آپ جو کہہ رہے ہیں اِس میں تو بہت سوچنا پڑے گا۔

ہاں، یہ کام ذرا توجہ مانگتا ہے۔ لیکن کوشش تو کرنی چاہیے۔ آؤ ذرا قریب سے دیکھتے ہیں! میرے ذہن میں ایک نانبائی ہے۔ اُس کا نام احسان ہے۔ اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا ہوتا ہے جب وہ اپنے ہاتھوں سے آٹا گوندھتا ہے اور گوندھی ہوئی روٹیوں پر اپنی انگلیوں سے نکتے ڈالتا ہے اور نقش و نگار بناتا ہے۔ پھر جب وہ مہکتی ہوئی، گرم گرم روٹیوں کو تنّور سے نکالتا ہے اور گاہک انھیں شوق سے لے جاتے ہیں تو اس کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے بزرگوں کی نصیحت بھی یاد آتی ہے کہ روٹی کی قدر کرو! کیوں کہ زمین آسمان، چاند سورج، ہوا پانی، سب حرکت میں آئے تو گندم کا خوشہ اگا اور تمھیں تمھاری روٹی میسّر آئی!

اس لیے ذرا سوچو، شام میں احسان تنّور بند کرتا ہے تو روٹیوں سے بھرا تھیلا کہاں لے جاتا ہے۔

اور کبھی وہ دیر سے گھر لوٹتا ہے تو کیسے اُس کے دو چھوٹے چھوٹے بچّے دروازے پر کھڑے اس کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔

احسان کا گھر سادہ سا ہے، وہ زمین پر بیٹھ کر کھاتا ہے، دل سے شکر بجا لاتا ہے، اور رات کو پرسکون نیند سوتا ہے۔

سر۔۔۔!

ہاں کہو؟

سر، یہ تو کہانی ہوگئی۔

ہاں، بالکل! کہانی ہی تو سنانی ہے! صرف پیشوں کی فہرست نہ بناؤ، کہانی سناؤ! بلکہ کئی کہانیاں سناؤ! شاید پورا انسان دکھائی دینے لگے!

سر، کہانی لکھنا تو بہت مشکل ہے۔

ارے نہیں بھئی، اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔ بس جس کی کہانی لکھنی ہو اُس کے ساتھ جا کر بیٹھو، اُس سے بات کرو، اُس کی آنکھوں سے زندگی کو دیکھو۔ خود بھی غور و فکر کرو۔ اور یہی سب لکھ دو۔ کہانی بن جائے گی!

سر، بس اس طرح؟

ہاں اور کیا! اور دنیا میں تو کہانیاں ہی کہانیاں بکھری ہوئی ہیں۔ بلکہ ہر انسان کے ساتھ ڈھیر ساری کہانیاں جڑی ہوتی ہیں۔ جیسے احسان کی بہت سی کہانیوں میں سے صرف ایک کہانی اس کا نانبائی ہونا ہے۔ لیکن اُس کے اندر ایک فن کار بھی ہے۔ ذمّہ دار باپ بھی ہے۔ ناداروں کا ہمدرد بھی ہے۔ زمین و آسمان پر غور و خوض کرنے والا مُفکّر بھی ہے۔ اور بھی بہت کچھ ہے اگر ذرا قریب سے دیکھو!

سر، اتنی ساری کہانیاں!

ہاں، اتنی ساری کہانیاں!

اب تم دیکھو کہ تم کون کون سی کہانیاں اخذ کرتے ہو، کیا سوچتے ہوئے اخذ کرتے ہو، اور پھر انھیں کیسے سناتے ہو!

مچھلیوں کو ڈوبنے سے بچانا[۲]

(تعمیری تنقید کے آداب)

(ڈائریکٹر جیم صاحب اسٹیج پر آ کر بات شروع کرتے ہیں۔)

آپ سب کو اس پریس کانفرنس میں خوش آمدید!

جیسا کہ ہمارے محکمے کی جانب سے آپ کو اطلاع دی گئی تھی، ہم ماحولیاتی تحفظ کے لیے ایک میگا پروجیکٹ کا آغاز کرنے جارہے ہیں جس میں مچھلیوں کو ڈوبنے سے بچایا جائے گا۔ سمندر میں ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں ایسی مچھلیاں ہیں جنھیں اس پروجیکٹ سے براہ راست فائدہ ہوگا۔ ہمیں سب کا ساتھ چاہیے۔ ہم تمام اسٹیک ہولڈرز کے ساتھ میٹنگ کر رہے ہیں۔ اور اسی سلسلے میں آج آپ سب کو مدعو کیا گیا ہے، خاص طور پر ہمارے سینیر صحافی اور تجزیہ کار جو اگلی نشستوں پر تشریف فرما ہیں۔ آپ سب کی تعمیری تنقید اس پروجیکٹ میں بہتری لانے کے لیے انتہائی اہم ہے۔

یہاں سب ہی ایک دوسرے سے واقف ہیں، اس لیے مزید کسی تعارف یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ بندہ آپ کے سامنے حاضر ہے، کوئی سوال ہو تو بلا تکلّف بیان فرمائیے۔

(کئی ہاتھ کھڑے ہوتے ہیں۔)

عین صاحب: سر، سب سے پہلے تو آپ کو مبارک ہو! کچھ اس پروجیکٹ کا پس منظر بتائیے۔ کیسے خیال آیا؟ کیسے یہ منصوبہ تشکیل پایا؟

---

[۲] ایک مشہور لوک کہانی کو یہاں عصری تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔

جیم صاحب: جی بہت شکریہ! دیکھیں زندگی بچانا فرض ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں۔ مچھلیوں کا تحفظ ہم سب کی ذمّہ داری ہے۔ لیکن ایک عرصے سے اس مسئلے کی سنجیدگی اور پوٹینشل دونوں کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ہماری انتظامیہ نے آتے ہی اس جانب توجہ دی۔ ہم نے آٹھ مہینے پلاننگ اور ٹیسٹنگ پر صرف کیے۔ اور ابتدائی کامیابیوں کے بعد اب اس پروجیکٹ کا باقاعدہ اعلان کیا جا رہا ہے۔

سین صاحب: جیم صاحب، کیا یورپ، امریکہ میں بھی اس طرح کی کوششیں کی گئی ہیں؟ اُن سے ہم کیا سیکھ سکتے ہیں؟

جیم صاحب: جی بالکل، اس طرح کا کام وہاں بڑے پیمانے پر کیا گیا ہے اور جدید سائنٹیفک طرز پر۔ لیکن اُن کا ماڈل سرمایہ دارانہ ہے جب کہ ہمارا فلاحی ہے۔ ہم اُن کے ماڈل سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں لیکن اسے بعینہٖ اپنے یہاں نافذ نہیں کر سکتے۔ ہم نے کوشش کی ہے اپنے مادی و ثقافتی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے خود اپنا ماڈل تشکیل دیں۔

نون صاحبہ: سر، سمندر تو مچھلیوں سے بھرا پڑا ہے، آپ ان سب کو تو نہیں بچا سکتے۔۔۔؟

جیم صاحب: جی بالکل، یہ ایک پریکٹیکل سوال ہے۔ آپ سب کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ ہم اس پروجیکٹ میں اسمارٹ نیٹس[3] متعارف کرا رہے ہیں۔ یہ اسمارٹ نیٹس سَو فیصد بایو ڈی گریڈیبل مٹیریل[4] سے بنے ہوئے ہیں اور ان میں صرف ٹارگٹ مچھلیاں پھنسیں گی، یعنی صرف وہ اقسام جو ہماری لسٹ میں موجود ہوں گی۔ سو آپ کی بات درست ہے کہ

---

[3] Smart Nets

[4] Biodegradable Material

ہمارے وسائل محدود ہیں، ہم ہر ایک کو نہیں بچا سکتے، لیکن اس کے باوجود ہم روزانہ ہزاروں کی تعداد میں مچھلیوں کو بچا پائیں گے۔

کاف صاحب: ڈائریکٹر جیم صاحب، اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ حکومت کو عوام ٹیکس دیتی ہے، مچھلیاں نہیں۔ ہمارے وسائل محدود ہیں۔ یہ محدود وسائل عوام کی فلاح و بہبود پر بھی خرچ کیے جا سکتے ہیں۔

جیم صاحب: کاف صاحب، آپ نے اہم نکتہ اٹھایا ہے۔ اور بلاشبہ آپ کے اس تنقیدی فیڈ بیک سے ہماری کاوشوں میں بہتری آئے گی۔ عرض یہ ہے کہ اس کُرّہ ارض پر بسنے والی تمام حیات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ یہاں ہم صرف مچھلیوں کو نہیں بچا رہے ہیں، اپنے اور اپنے بچّوں کے مستقبل کو بھی محفوظ بنا رہے ہیں۔ اور اس پروجیکٹ سے تو عوام کو براہ راست فائدہ ہوگا۔ روزگار کے مواقع پیدا ہوں گے۔ کئی صنعتوں کو فروغ ملے گا۔ پورا ملک ترقی کرے گا۔

لیکن میں جانتا ہوں، کاف صاحب، آپ مطمئن نہیں ہوئے ہیں۔ میرے جواب کی وضاحت ایک اور بنیادی سوال کے جواب میں ہو جائے گی۔ لیکن وہ سوال اب تک سامنے نہیں آیا ہے۔ میں منتظر ہوں کہ وہ سوال پوچھا جائے۔

شین صاحبہ: سر، مچھلیاں تو پانی سے باہر نکل کر مر جائیں گی---؟

جیم صاحب: جی بالکل، شین صاحبہ، میں اسی سوال کا منتظر تھا۔ مچھلیوں کو ڈوبنے سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ لیکن پانی سے باہر نکالے جانے کے بعد اگر وہ خود ہی مر جائیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے کم از کم اپنا فرض ادا کر دیا۔ ہاں سینکڑوں ٹن مچھلیوں کو یوں خشکی پر پڑا رہنے نہیں دیا جاسکتا۔ یوں تو ایک ماحولیاتی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ اور آپ سب جانتے ہیں کہ ---

شین صاحبہ: لیکن سر مچھلیوں کو واپس سمندر میں بھی پھینکا جاسکتا ہے---؟

جیم صاحب: جی جی، شین صاحبہ، میں عرض کرتا ہوں۔ دیکھیں مچھلیوں کو سمندر میں واپس پھینک دینا ضیاع ہوگا۔ اور ضیاع کرنا غیر اخلاقی بھی ہے اور ہمارا ترقی پذیر ملک اسے افورڈ بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے ہم پبلک-پرائیوٹ پارٹنر شپ پر مبنی ایک مکمل اِیکو-سولوشن[5] لائے ہیں۔ خشکی پر آتے ہی مچھلیوں کو پروسسنگ پلانٹ میں پہنچا دیا جائے گا جہاں انھیں جدید مشینری کے ذریعے پروسس کر کے مارکیٹ میں فروخت کے لیے تیار کیا جائے گا۔ یہ آپریشن دن رات جاری رہے گا۔ اور اسے سائنٹیفک افیشنسی[6]، زیرو ویسٹ[7]، اور مکمل ٹرانسپیرنسی[8] کے اصولوں پر چلایا جائے گا۔

یہاں آپ سب سمجھ سکتے ہیں کہ مچھلیوں کو بچانے سے لے کر مارکیٹ پہچانے تک سینکڑوں افراد کو روزگار ملے گا، کئی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوگا اور عوام تک تازہ اور ایتھیکلی کانشس[9] بنیادوں پر بچائی گئی مچھلیاں پہنچیں گی، بلکہ ہم ان مچھلیوں کو ایکسپورٹ بھی کر سکیں گے۔ یعنی اس میگا پروجیکٹ میں سب کا فائدہ ہے، معیشت کا، عوام کا، مچھلیوں کا۔ اس پوری تصویر کو دیکھیں تو عوام کو اُن کے ٹیکس کے پیسوں پر کئی گنا ریٹرن ملنے والا ہے۔ کیا یہ وِن وِن سچویشن نہیں ہے!

(حاضرین میں سے ایک دو افراد بے ساختہ تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ دوسرے بھی ساتھ دیتے ہیں۔)

---

[5] Eco Solution

[6] Scientific Efficiency

[7] Zero Waste

[8] Transparency

[9] Ethically Conscious

جیم صاحب: میرا خیال ہے بنیادی سوالات کوَر ہو گئے ہیں۔ اگر کوئی رہ گیا ہو تو کونسا ایسا سوال ہے جو چائے سموسوں پر حل نہ ہوسکے!

جی جی، میٹھا بھی ہے! میٹھے کے بغیر بات کیسے مکمل ہو سکتی ہے!

ایک بار پھر میں آپ سب کی تشریف آوری کا بے حد شکر گزار ہوں!

آئیے، اس طرف!

جی جی، ساتھ چلتے ہیں!

میں اور تم

(متضاد الفاظ)

دوستو، آج آپ کی مِس نہیں آسکی ہیں۔ کل اردو کا فائنل ہے۔ اس لیے رویژن کے لیے میں آپ کی مدد کروں گی۔ میں مِس سارا ہوں۔ یونیورسٹی میں لسانیات کی طالبہ ہوں۔ آپ کے اسکول میں آج کل ریسرچ کر رہی ہوں۔

ہاں تو بتائیں، رویژن کے لیے کچھ رہ گیا ہے؟ یا کوئی چیز مشکل لگ رہی ہو؟

مِس، بس متضاد الفاظ کو ریوائز نہیں کیا۔ آسان تھا اس لیے چھوڑ دیا۔

ارے، کیا دلچسپ موضوع ہے! کوئی متضاد الفاظ کی مثال دے گا؟

(مختلف آوازیں آنے لگیں۔)

مِس، جیسے لڑکا/لڑکی!

جیسے دن/رات!

چاند/سورج!

شیعہ/سنی!

مسلمان/ہندو!

زندگی/موت!

چچ چچ، ارے ٹھہرو بھئی۔۔۔! ایک وقت میں ایک مثال کو لیتے ہیں۔ یہ لڑکا اور لڑکی کیسے ایک دوسرے کی ضد ہوگئے؟

مِس، وہ ضد نہیں ہیں کیا۔۔۔؟

ارے ضد کیسے ہوگئے۔ تم بتاؤ، لڑکا، لڑکی سے تو جوڑے بنتے ہیں۔ شوہر اور بیوی کی جوڑی۔
ماں اور باپ کی جوڑی۔ سورج اور چاند کی جوڑی۔ سونا اور چاندی کی جوڑی۔

مِس، آپ تو مذکر و مونث کی بات کر رہی ہیں؟

ہاں، مذکر و مونث بھی ہیں۔ لیکن یہاں لڑکا، لڑکی کو ضد کے طور پر ہی کیوں دیکھا جائے؟

لیکن مِس، وہ جو کہتے ہیں۔۔۔ 'مخالف جنس'! (پہلی آواز)

نہیں۔۔۔ 'جنسِ مخالف'! (دوسری آواز)

اوہو، اگر ایک دوسرے کو مخالف کے طور پر دیکھیں گے تو امکان ہے ایسا ہی رویّہ رکھیں گے۔

لیکن مِس، پھر 'لڑکا' کی ضد کیا ہوگی؟

ارے بھئی ضروری تو نہیں ہر چیز کی ضد ہو۔ یا ہر چیز کو اس کی ضد تلاش کر کے ہی سمجھا جائے۔

لیکن مِس، امتحان میں آئے گا تو کیا لکھیں گے؟

میرے بھائی، بات کو سمجھنا زیادہ اہم ہے۔

لیکن مِس، امتحان بھی تو پاس کرنا ہے!

چچ، ارے بات سمجھ میں آ جائے گی تو امتحان بھی پاس ہو جائے گا۔ اچھا اور کون سی مثال دی تھی؟ ہاں بتاؤ، یہ شیعہ سنی کیسے ایک دوسرے کی ضد بن گئے؟

مِس، وہ بھی تو 'مخالف فرقے' کہلاتے ہیں۔

ام م م، لیکن ایک زاویے سے دیکھو تو شیعہ، سنی سب ایک ہی خدا، ایک ہی نبی، اور ایک ہی کتاب کے ماننے والے ہیں۔ سب مسلمان ہیں۔ بھلا مخالف کیسے ہوئے؟

مِس، یعنی آپ کہہ رہی ہیں کہ شیعہ، سنی مترادف ہیں؟ ہم معنی ہیں؟

نہیں، ہم معنی نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ ایک مسلک، دوسرے مسلک سے مختلف بھی ہو، ضروری تو نہیں ایک دوسرے کی ضد بنیں۔ مکتبِ فکر کا اختلاف ہونا اپنی جگہ ہے، لیکن اس کا مطلب ایک دوسرے کی نفی میں رہنا تو نہیں۔

لیکن مِس، امتحان میں آئے گا تو کیا لکھیں گے؟

ﭼﭻ، ارے بھئی امتحان میں آئے تو لکھ دینا کہ سب خدا کے بندے ہیں۔ مشترک باتیں بھی پائی جاتی ہیں اور اختلافی بھی۔ سادہ، منجمد خانوں میں ڈال کر متضاد الفاظ نہیں بنائے جاسکتے۔ اور یہ بھی لکھ دینا کہ ایک مسلک کو سمجھنے کے لیے ضروری نہیں اُسے دوسرے کی ضد کے طور پر دیکھا جائے۔

مِس۔۔۔! (ایک آواز)

ہاں کہو؟

مِس، میں سوچ رہا ہوں پھر دن اور رات بھی یوں مخالف نہیں ہوئے؟

واہ واہ۔۔۔ ٹھیک پہنچے! دن اور رات ضروری تو نہیں ہمیشہ متضاد کہلائیں! مثلاً ڈھلتی شام اور علی الصبح کے مناظر پر غور کرو۔ کیسے رات دن کو ڈھانپ رہی ہوتی ہے اور دن رات کو۔ دن میں رات بھی ہوتی ہے اور رات میں دن بھی۔ الگ الگ ہیں، لیکن جدا بھی نہیں۔ اسی طرح سانس کا اندر لینا اور باہر نکالنا ہے۔ الگ الگ ہیں، لیکن جدا بھی نہیں۔ یوں دیکھنے لگو تو کائنات کی حقیقتیں اور بھی گہرائیوں میں نظر آنے لگیں گی۔

اور سوچو تو لڑکا اور لڑکی کے معاملے میں بھی، 'میں' اور 'تم' کا فرق تو ہے لیکن میں، تم سے جدا بھی نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کو کمپلیمنٹ[10] کرتے ہیں، یِن۔یانگ[11] کی طرح جوڑی بناتے ہیں۔ جیسے برق کے مثبت اور منفی چارج ہوتے ہیں، یا جسے ہم نے مثبت اور منفی نام دیا ہوا ہے۔ بظاہر مخالف ہوتے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔ ہاں جہاں ضد اور نفی کے منجمد خانے بن جائیں وہاں بات میں اور تم سے نکل کر تو تو، میں میں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے متضاد کے معاملے میں بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

لیکن مِس، امتحان میں تو صرف صحیح جواب لکھنا ہوتا ہے۔ یا 'خالی جگہ پُر' کرنے کے لیے آتی ہے یا خانوں کو ملانا ہوتا ہے۔ اتنی ساری باتوں کی جگہ نہیں ہوتی؟

چچ، ارے تو جگہ بنا کر پوری بات لکھ دینا نا! اور یہ بات زور دے کر لکھنا کہ یہ لفظوں کا کھیل نہیں، زندگی کا معاملہ ہے۔ محض ضد میں دیکھنے کی عادت پڑ جائے، تو زندگی بھی اسی طرح ضد میں گزر جاتی ہے۔

لیکن مِس، صحیح جواب نہیں لکھیں گے تو نمبر کٹ جائیں گے!

ارے بھئی، نمبر کٹتے ہیں تو کٹنے دو۔ معاملے کی اہمیت کو سمجھو۔ سوچو، اگر ان میں سے کئی الفاظ ایک دوسرے کے مخالف نہ رہیں تو معاشرے کیسے سنور جائیں گے! کیا تم یہ نہیں چاہو گے؟

لیکن مِس، پہلے امتحان پاس کرنا ہے، اگلی جماعت میں جانا ہے!

---

[10] Complement

[11] Yin-Yang

پچ، کیا امتحان، امتحان کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔ بس لکھ دینا کہ ہر لفظ کو انفرادی طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ یعنی کونسا لفظ کہاں، کس تناظر میں ضد ہے، کہاں ضد نہیں، کہاں صرف مخالف ہے، کہاں جوڑی بناتا ہے۔ کچھ نمبر کٹ بھی جائیں تو کیا حرج ہے، کم از کم امتحانی پرچہ بنانے والوں تک کام کی بات پہنچ جائے گی۔

مِس، آپ نے تو کنفیوز کر دیا۔ جو یاد تھا وہ بھی ذہن میں گڈ مڈ ہو گیا ہے۔

واہ بھئی، یعنی یہ بحث بے فائدہ نہیں رہی!

نہیں مِس، آپ بس صحیح والے متضاد الفاظ کی ایک فہرست بنا کر دے دیں، ہم یاد کر لیں گے۔

ارے بھئی، بنی بنائی فہرست ہی تو یاد نہیں کرنی ہے، تنقیدی طرزِ فکر کی آبیاری کرنی ہے!

مِس، آپ ضد تو نہ کریں نا! دیکھیں کل ہمارا فائنل ہے!

اچھا ذرا لکھو۔۔۔ استاد۔۔۔ شاگرد۔۔۔!

ہاں کیا ہوا؟

مِس، کیا یہ واقعی متضاد ہیں؟

ہاں بالکل! یہی بات! ہر لفظ پر غور کرنا ہوگا۔ استاد، شاگرد ضد بھی کریں، بظاہر ایک دوسرے کی نفی بھی کریں، پھر بھی ضروری نہیں متضاد کہلائیں!

اور اب بات سمجھ میں آ رہی ہے تو آؤ، ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں اور حاشیے ڈال کر کچھ فہرست سی بنانے کی کوشش کرتے ہیں!

چڑیا گھر کی سیر

(قدرتی ماحول سے آگاہی)

(ایک ایلیمنٹری اسکول کی پرنسپل کے دفتر میں میٹنگ ہو رہی ہے۔)

میڈم (غور سے دیکھتے ہوئے): زہرا، آپ لوگ چڑیا گھر کی سیر کو گئے تھے؟

زہرا: جی میڈم---؟

میڈم: کیسا رہا ٹرِپ؟

زہرا: میڈم، وہی پنجرے تھے، جانور تھے، اُن کے بچّے تھے۔ اور باہر ہم انسان اور ہمارے بچّے انھیں دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

میڈم: ہم م م--- کوئی خاص بات ہوئی تھی؟

زہرا: خاص بات---؟

میڈم: ہاں، کچھ بچّے رونے لگے تھے---؟

زہرا: اوہ ہاں--- وہاں کچھ بچّے جانوروں کو دیکھ کر رونے لگے تھے۔ بچّوں میں یہ فطری بات ہے۔

میڈم: لیکن صرف آپ کے ساتھ جو بچّے تھے وہ روئے تھے؟

زہرا: جی میڈم، دوسرے بچّوں کا مجھے نہیں معلوم۔

میڈم: آپ کو معلوم ہے کچھ پیرنٹس نے شکایت کی ہے۔

زہرا: میڈم، چڑیا گھر جا کر تو سب بچّوں کو رونا چاہیے، اب سب بچّے نہیں روئے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔

میڈم: زہرا، آپ بات کو سنجیدگی سے لیں۔ اُن بچّوں میں بورڈ کے چیئرمین کا لڑکا بھی تھا۔

زہرا: میڈم، چیئرمین صاحب اپنے لڑکے سے پوچھ لیتے کیوں رویا تھا۔ شاید اُن کی شکایت دور ہوجاتی۔

میڈم: زہرا، آپ مجھے بتائیں گی وہ بچّے کیوں روئے تھے؟

زہرا: جی میڈم۔ میڈم، ہم ہاتھی کے پنجرے کے سامنے گئے تھے۔ پنجرے پر معلومات کی تختی لگی ہوتی ہے جس میں ہاتھی کی قسم، آبائی وطن، اوسط قد، خوراک، مدت حیات وغیرہ کے بارے میں لکھا ہوتا ہے۔ میں نے تعارف وہاں سے شروع نہیں کیا بلکہ بچّوں کو نام بتائے۔ وہاں دو نوجوان ہتھنیاں تھیں۔ رکھوالوں نے ایک کا نام چنبیلی رکھا ہے اور دوسری کا گلابو۔ اس سے پہلے ایک ہتھنی کا نام کنول رکھا گیا تھا جو چند برس پہلے مرگئی۔

میڈم: لیکن نام بتانے سے رونے کا کیا تعلق؟

زہرا: میڈم، میرا خیال ہے نام بتانے سے بچّے اُن ہتھنیوں کو انفرادی طور پر دیکھنے لگے۔ وہ انگلی سے اشارہ کر کے ایک دوسرے سے کہنے لگے، یہ چنبیلی ہے، وہ گلابو ہے۔ دونوں ہتھنیاں الگ الگ پنجرے میں تھیں اور بے چین، ہائپر انداز میں مسلسل ایک کونے سے دوسرے کونے کا چکر لگا رہی تھیں۔ بچّوں نے مجھ سے پوچھا کہ اس طرح چکر کیوں لگا رہی ہیں۔ میں نے بتایا کہ جہاں سے یہ دونوں آئی ہیں وہاں قدرتی ماحول میں رہتی تھیں۔ روزانہ بیس، پچیس میل چلتی تھیں۔ یہ ان کی فطری ضرورت ہے۔ لیکن اب اتنے سے پنجرے میں کیسے چلیں۔ اور وہاں اپنے پیاروں کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کے امّی، ابّو تھے۔

سب ساتھ میں چلتے تھے، کھاتے تھے، پیتے تھے۔ یہاں تو بس یہ دو ہیں۔ جب جنگلی جانوروں کو یوں پنجروں میں قید کر دیا جائے، تو انھیں زو-کوسِس[۱۲] ہو جاتا ہے۔

میڈم: زو-کوسِس---؟

زہرا: ہائپر انداز میں گول گول گھومنا یا ایک کونے سے دوسرے کونے تک مسلسل چکر لگانا، وغیرہ۔ یہ جانوروں میں انزائٹی اور ڈپریشن وغیرہ کی علامات ہیں جو 'زو' یعنی چڑیا گھر کی قید میں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اور صرف ہاتھیوں میں نہیں، دوسرے جنگلی جانوروں میں بھی یہ علامات دیکھی گئی ہیں۔ کچھ قسم کے پرندوں کو بھی ہائپر انداز میں گھومتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اور میڈم، یہ مسئلہ صرف ہمارے یہاں نہیں ہے، مغربی ممالک میں بھی یہی صورتحال ہے، جب کہ وہاں چڑیا گھروں کے پاس عموماً زیادہ وسائل ہوتے ہیں۔ خبروں میں یہ بھی آیا تھا کہ بعض جگہوں پر جانوروں کو اینٹی ڈپریسنٹ کھلائی جاتی ہیں تا کہ وہ خوش خوش نظر آئیں۔ ہاتھی جیسے جانوروں کے لیے ایک مصیبت یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر پنجرے کا فرش سیمنٹ وغیرہ کا بنا ہو تو سخت زمین پر مسلسل چلنے سے ان کے پاؤں میں ارتھرائٹس جیسے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔

میڈم: زہرا، آپ نے یہ سب بچّوں کو بھی بتا دیا؟

زہرا: سب تو نہیں، بس زو-کوسس کی کچھ علامات بتائی تھیں۔ لیکن اس کے بعد یہ ہوا کہ بچّے ایک کے بعد ایک جس پنجرے کے پاس جاتے تو کبھی جانور کا نام پوچھتے، کبھی کہتے کہ مِس اِن کو بھی زو-کوسس ہوگیا ہے۔ پھر نجانے کیا ہوا، لیکن شاید کچھ بچّوں نے کوئی

---

[۱۲] Zoochosis

بات گہرائی میں محسوس کر لی۔ میں اب اُن قید کیے ہوئے جانوروں کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پاتی ہوں، لیکن شاید ان بچّوں نے کچھ دیکھ لیا اور رونے لگے۔

میڈم: زہرا، ہم چڑیا گھر میں بچّوں کو صرف قدرتی ماحول سے آگاہی کی غرض سے لے جاتے ہیں، تا کہ بچّے اُن جانوروں کو اصل زندگی میں دیکھ سکیں جن کی بس تصویریں کتابوں میں دیکھی ہوتی ہیں۔ مقصد صرف تعلیمی ہوتا ہے، نہ کہ یہ سب کچھ!

زہرا: میڈم، تعلیم کے اندر ہی بچّوں کی تربیت بھی تو ہو رہی ہوتی ہے۔ ان کے افکار، قدریں، میل ملاپ، غرض کہ ان کی پوری شخصیت پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔ چڑیا گھر جا کر بچّے جانوروں کو دیکھتے ہیں، ان کی اقسام وغیرہ کو یاد کرتے ہیں، تصویریں کھنچواتے ہیں، لیکن دل کی آنکھوں کو بند کر لیتے ہیں۔ ڈی سِنسیٹائزڈ[۱۳] ہو جاتے ہیں۔ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ جانوروں کے ساتھ اسی طرح برتاؤ کیا جاتا ہے۔ میڈم، اس طرح تو ہم اپنے بچّوں کا بہت نقصان کر دیتے ہیں۔

میڈم: زہرا، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ چڑیا گھر کے کونسیپٹ ہی سے اتفاق نہیں کرتی ہیں؟

زہرا: جی میڈم، دنیا بھر میں اکثر چڑیا گھر درحقیقت ٹارچر گھر ہیں اور انھیں ختم ہی کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ ایک زمانے میں ہمارے گھروں میں گائے، بکریاں، مرغیاں وغیرہ پالی جاتی تھیں۔ وہ تو گھر کا حصّہ سمجھے جاتے تھے۔ بچّے اپنے بڑوں کو دیکھ کر سیکھتے تھے کہ جانوروں کو کیسے پالنا ہے، ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا ہے۔ اچھے گھرانوں میں جانوروں کے ساتھ نیک سلوک پر زور دیا جاتا تھا۔ میڈم، ہم چاہیں تو اپنے اسکول میں اس طرح کا کام

---

[۱۳] Desensitized

کرسکتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا اسکول گارڈن بنا سکتے ہیں۔ یوں ہمارے بچّے جانوروں سے مستقل رابطے میں آجائیں گے۔ اُن کا احترام کرنا سیکھیں گے۔ قدرتی ماحول سے بہتر آگاہی حاصل کریں گے۔

میڈم: لیکن زہرا، ہم اسکول میں ہاتھی، شیر وغیرہ تو نہیں لا سکتے! ان جنگلی جانوروں کے بارے میں جاننا بھی ہمارے نصاب کا حصّہ ہے۔

زہرا: میڈم، ہم صرف آدھے دن کے لیے چڑیا گھر جاتے ہیں، بھلا اتنے سے وقت میں ہم وہاں جانوروں کے بارے میں کس حد تک جان سکتے ہیں؟ بلکہ جو جان پاتے ہیں وہ بھی قابل اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ کیوں کہ چڑیا گھر میں جنگلی جانور اپنی قدرتی حالت میں تو نہیں ہوتے۔ وہ تو مصنوعی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم انسانوں نے انھیں الگ الگ پنجروں میں رکھا ہوتا ہے، جب کہ قدرتی ماحول میں وہ سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ ایک باہمی انحصاری[۱۴] اور ایکولوجیکل یونیٹی[۱۵] کی کیفیت ہوتی ہے جس میں خشکی پر چلنے والوں کا واسطہ ہوا میں اڑنے والوں سے بھی ہوتا ہے اور پانی میں تیرنے والوں سے بھی۔ چڑیا گھر میں تو جانور بس الگ الگ پنجروں میں قید ہوتے ہیں، اداس بیٹھے ہوتے ہیں، ہائپر انداز میں چکر لگا رہے ہوتے ہیں۔ اور ہم انسان وہاں جا کر ان کی اذیّت میں اضافہ کرتے ہیں۔ انھیں تنگ کرتے ہیں، کنکر پھینکتے ہیں۔ اس سے بہتر آگاہی تو ڈھنگ سے بنی کسی ڈوکیومنٹری دیکھنے سے مل سکتی ہے۔

---

[۱۴] Interdependence

[۱۵] Ecological Unity

میڈم: لیکن زہرا، ان ڈوکیومنٹریز کو بنانے کے لیے بھی تو جانوروں کو ڈسٹرب کیا جاتا ہے۔ سنسنی خیز بنانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹرینکولائزر[۱۶] وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔

زہرا: جی میڈم، یہ مسئلہ ضرور ہے۔ لیکن اچھی ڈوکیومنٹریز ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ اور نہ ملے تو پالتو جانوروں سے بھی بچّے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

میڈم: لیکن زہرا، ہمیں اپنے نصاب کو بھی فالو کرنا ہے۔ یہ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں، باہر سے بن کر آتا ہے۔

زہرا: میڈم، جن شہروں میں چڑیا گھر نہیں ہیں وہاں بھی تو یہ نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اور میڈم، اس نصاب میں تو نظر ثانی کی خاصی ضرورت ہے۔ صرف چڑیا گھر کے حوالے سے نہیں بلکہ پورا کونسیپٹ، پورا وژن بدلنے کی ضرورت ہے۔ ایسے کہ نصاب میں ہم انسان قدرتی ماحول کا حصّہ ہوں، اس کے باسی ہوں، رکھوالے ہوں، نہ کہ مالکِ کُل۔

میڈم: جی مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کو نصاب میں شامل شکار کی داستان پر بھی اعتراض ہے۔ اور کچھ نظموں پر بھی آپ نے اعتراض کیا ہے۔

زہرا: جی میڈم، چڑیا گھر جا کر بچّے سیکھتے ہیں کہ شیر، ہاتھی جیسے جانور بے زبان ہوتے ہیں اور ان کے احساسات نہیں ہوتے، لیکن شکار کی داستانوں میں تو شیر، ہاتھی اندر سے درندے نکلتے ہیں، خونخوار بن کر انسانوں پر حملہ کرتے ہیں، جنھیں یا تو قابو میں لایا جاتا ہے یا قتل کر دیا جاتا ہے۔ میڈم، ان داستانوں میں پھر بھی کوئی توجیہ پیش کی جاتی ہے، لیکن اصل زندگی میں تو اس طرح کا شکار محض تفریح کے لیے کیا جاتا ہے۔ بولیاں لگا کر شکار کا

---

[۱۶] Tranquilizers

پرمٹ لیا جاتا ہے۔ جانوروں کی لاشوں پر پاؤں رکھ کر تصویریں کھنچوائی جاتی ہیں۔ سر اور کھال کو ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سجایا جاتا ہے۔ میڈم، ہمارے موجودہ معاشروں میں ویسے بھی جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا، اوپر سے یہ شکار کی داستانیں لوگوں کو اور بھی پتھر دل بنا دیتی ہیں۔

میڈم: زہرا، لوگ عموماً پتھر دل نہیں ہوتے ہیں، بس اس جانب دھیان نہیں ہوتا۔

زہرا: بالکل میڈم، یہیں تعلیم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ یعنی تعلیم کے ذریعے ہم لوگوں کی توجہ مبذول کروائیں، نہ کہ ہم خود انھیں بے حس بنا دیں۔

میڈم: زہرا، ہم ہر سال آرتھ ڈے مناتے ہیں۔ پودے لگانے کی مہم چلاتے ہیں۔ ری۔ سائیکلنگ کے لیے کئی کوڑے دان رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے بچّوں کو کچھ ایکسپوژر تو مل رہا ہے۔ لیکن مکمل تربیت کی ذمّہ داری ہم نہیں لے سکتے۔ یہ تو انھیں گھر سے ملنی چاہیے۔ خیر، آپ یہ بتائیں میں چیئرمین صاحب کو کیا جواب دوں۔۔۔؟

زہرا: میڈم، چیئرمین صاحب کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ان کے بچّے کا دل ابھی سلامت ہے۔ ہم اب تک اسے بے حس بنانے میں کامیاب نہیں ہوئے!

میڈم (اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے): زہرا، میں آپ کے کنسرنز کو سمجھ رہی ہوں، لیکن آپ بھی بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں اپنے نصاب کو فالو بھی کرنا ہے اور اپنے بچّوں کو خوش بھی رکھنا ہے، خاص طور پر چیئرمین صاحب کے بچّے کو۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا۔ اس لیے کوشش کریں آئندہ بچّے نہ روئیں۔ کیا آپ یہ کرسکیں گی؟

زہرا: جی میڈم، میں کوشش کروں گی۔

میڈم: گُڈ! میرا خیال ہے اگلے سال ہم بچّوں کو چڑیا گھر کے بجائے کسی فارم ہاؤس لے جا سکتے ہیں، جہاں مختلف اقسام کے جانور ہوں اور انھیں اچھی طرح رکھا جاتا ہو۔ شہر سے باہر اورگینِک فارمنگ کے نام پر کئی فارم ہاؤس چل رہے ہیں، شاید ایک دو ہمارے کام کے نکل آئیں۔ اس کے علاوہ ہم اپنی ریسورس لائبریری میں نئی ڈوکیومنٹریز وغیرہ شامل کرسکتے ہیں۔اور آپ نے جو اسکول گارڈن کی بات کی ہے، میرا خیال ہے ہم اس پر کسی حد تک کام کر سکتے ہیں۔ ہمارے بیک یارڈ میں اس وقت کچھ گملے پڑے ہوئے ہیں، لیکن ایک گارڈن کے لیے جگہ بنائی جا سکتی ہے۔ آپ ایک پروپوزل بنا کر مجھے بھیجیں گی؟

زہرا (دمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ): جی میڈم، کیوں نہیں!

میڈم (مسکراتے ہوئے): میں انتظار کروں گی!

باسْ شاہی

(مستند لغت)

محترم اساتذہ و طلَبہ، اس سالانہ ادبی محفل میں کلیدی خطاب کے لیے مدعو کرنے کا بہت شکریہ! اس اسکول کے ایک سابق طالب علم ہونے کی حیثیت سے میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ میں اب ایک اخبار میں ایڈیٹر ہوں اور تخلیقی ادب کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہوں، لیکن اس اسکول میں اپنے آپ کو ایک طالب علم ہی کے طور پر دیکھتا ہوں۔ ہاں سامنے بیٹھے ہوئے طلبہ سے عمر ذرا زیادہ ہوگئ ہے! میں چاہوں گا کہ اپنے جیسے دیگر طلبہ کے لیے ایک تنقیدی بحث پیش کروں۔ اس بحث کو تخلیقی ادب کے سانچے میں تیار کیا گیا ہے۔ امید ہے آپ اسے دلچسپ و مفید پائیں گے۔

تو دوستو، آپ نے 'ب' سے بادشاہی کا لفظ تو سنا ہوگا لیکن شاید 'ب' سے باسْ شاہی نہیں سنا ہوگا۔ باس شاہی ایک مستند لفظ ہے لیکن کم سنا گیا ہے۔ اتنا کم کہ نیا ہی سمجھیں۔ لیکن اگر یہ لفظ ذہن میں رہے تو بڑے کام کا ہے۔

اب یہ باس شاہی کیا ہے، اس لفظ کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ آپ بھی وہ کہانی جان لیں گے تو مطلب بہتر سمجھ سکیں گے۔

باسْ شاہی کی کہانی[۱۷]

---

[۱۷] اس کہانی کی اِنسپریشن کئی جگھوں سے ملی، خاص کر ایک مشہور لوک کہانی سے جو اب ڈینش قلمکار، ایچ۔ سی۔ اینڈرسن کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔ اینڈرسن کی کہانی کا انگریزی عنوان ہے: The Emperor's New Clothes

گئے وقتوں کا ذکر ہے کسی علاقے میں ایک نیک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ جو لفظ باد۔شاہ کے آخر میں شاہ آتا ہے، اس سے 'شاہی' اور 'شاہانہ' جیسے الفاظ تو آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ بادشاہ لوگ عام انسان ہی ہوتے تھے لیکن انداز شاہانہ رکھا کرتے تھے۔ شاہانہ نام و نسب اختیار کرتے تھے۔ شاہانہ الفاظ و القاب میں بات کرتے تھے۔ شاہانہ کپڑے پہنتے تھے۔ شاہانہ کھانا کھاتے تھے۔ جسے چاہتے شاہانہ انعام و اکرام دیتے تھے۔ بلکہ دیتے نہیں، انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔

بچپن سے اکثر کہانیوں میں آپ نے یہی بحث دیکھی ہوگی کہ بادشاہ یا نیک تھا یا ظالم۔ لکھنے والے اس سوال کو کم زیرِ بحث لاتے ہیں کہ بادشاہ چاہے نیک ہو یا ظالم، اسے کس نے حق دیا ہے کہ خود شاہ بن جائے اور عوام کو اپنی رعیّت بنا لے۔ یعنی اپنے جیسے دوسرے انسانوں کا مالک بن جائے اور ان کی کمائی پر عیاشی کرے۔ جس سے خوش ہوجائے اس پر انعام و اکرام کی بارش کر دے اور ناراض ہوجائے تو زندان میں جھونک دے۔ اور جب وہ بادشاہ مرے تو اسی کی اولاد میں سے کوئی دوسرا عوام پر مسلط ہوجائے۔ چاہے نیا آنے والا لائق ہو یا نالائق، آخر ان شاہوں کو یہ سارے اختیارات کس نے دے ڈالے؟

خیر، ہماری کہانی کا بادشاہ ایک نیک بادشاہ تھا۔ نیک بادشاہ کا ملک نیا نیا آباد ہوا تھا۔ وہ عوام کا بڑا خیال رکھتا تھا اور عوام کی بھی ایک بڑی تعداد اسے چاہتی تھی۔ کبھی نیک بادشاہ اپنی پالکی پر سوار محل سے باہر نکلتا تو عوام خوشی خوشی پالکی کو کاندھوں پر اٹھا لیتی اور بادشاہ کو سیر کراتی۔

ایک دن منادی کرائی گئی کہ نیک بادشاہ اگلے دن سیر کے لیے محل سے باہر تشریف لائیں گے۔ سو اگلے دن عوام کی ایک بڑی تعداد بادشاہ کے دیدار کے لیے جمع ہوگئی۔ مجمع میں

ایک بوڑھا سُنار اور اس کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔ وہ سنار، نیک بادشاہ کا بڑا شیدائی تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ بادشاہ کو اپنے کاندھوں پر سوار کرائے۔

بالآخر نیک بادشاہ اپنی پالکی پر سوار محل سے باہر آیا۔ اس تخت نما پالکی کے آگے پیچھے لکڑی کے چار بازو جڑے ہوئے تھے۔ ان بازوؤں کی مدد سے اس کُھلی پالکی کو اٹھایا جاتا تھا۔

بادشاہ کو دیکھ کر وہ سنار باپ، بیٹا مجمع کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ بوڑھے سنار نے پالکی کے ایک بازو کو محافظ کے ہاتھوں سے لیا اور بیٹے نے دوسرے بازو کو۔ پچھلے بازوؤں کو دوسروں نے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ پھر بادشاہ کے اشارے پر سب سیر کے لیے چل پڑے۔

پالکی کے ساتھ ساتھ محافظ بھی چل رہے تھے۔ بادشاہ پالکی پر بیٹھے ہوئے کبھی ہاتھ کو سینے پر رکھ کر اور کبھی ہوا میں لہرا کر عوام کے والہانہ نعروں کا جواب دے رہا تھا۔

پالکی پر سوار بادشاہ کے پیر اُن دونوں باپ بیٹے سے نزدیک تھے اور ان پیروں سے کچھ بدبو آ رہی تھی۔ نوجوان بیٹے نے کچھ دیر تو صبر کیا، پھر مزید برداشت نہ ہوا تو باپ سے سرگوشی میں بولا کہ باسْ آ رہی ہے۔ ساتھ ہی آنکھوں سے بادشاہ کے پیروں کی جانب اشارہ کیا۔

باپ نے فوراً بیٹے کو ٹوکا اور اسی سرگوشی کے انداز میں بولا کہ باس تو عام لوگوں کے پاؤں سے آتی ہے۔ یہ تو شاہ ہیں، ان سے 'باس شاہی' آتی ہے۔ نوجوان بیٹا یہ سن کر بہل گیا۔ لیکن بادشاہ کے محافظوں نے یہ گفتگو سن لی!

اب ایک روایت یہ ہے کہ بوڑھے سنار نے 'باسِ شاہی' کہا تھا اور محافظین نے اسے جزْم کے ساتھ 'باسْ شاہی' بنا دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق بوڑھے سنار نے 'باسْ شاہی' ہی کہا تھا اور محافظین نے اسی تلفّظ کے ساتھ بات آگے پہنچائی۔ خیر جو بھی حقیقت ہو، یہ نیا لفظ محافظوں سے بادشاہ کے مُصاحبوں تک اور پھر خواص اور عوام سب میں مشہور ہوگیا۔

لوگ اب اور بھی شوق سے نیک بادشاہ کو دیکھنے آتے، اپنے کاندھوں پر سوار کراتے، باس شاہی کو سونگھتے، اُس کا گلاب و موتیے سے موازنہ کرتے، اور خوشی خوشی گھر لوٹ جاتے۔ البتہ بادشاہ کو دیکھنے آنے والوں میں سے کچھ لوگ باس شاہی سونگھ کر مایوس ہوتے تھے۔ انھیں تو بس بدبو محسوس ہوتی تھی۔ لیکن بھلا یہ بات کہہ کر وہ بے ادبی کیسے کرسکتے تھے۔ بس اتنا ہوتا کہ وہ واپس چلے جاتے اور آئندہ بادشاہ کو کاندھوں پر سوار کرانے کے لیے نہیں آتے۔

عوام کی اکثریت بادشاہ کے پائے تخت سے دور علاقوں میں رہتی تھی۔ ان تک باس شاہی کے بس چرچے پہنچے تھے۔ خود انھوں نے نیک بادشاہ کو دیکھا تھا نہ باس شاہی کو سونگھا تھا۔ لیکن وہ یہ سن کر ہی سرور کی کیفیت میں آ جاتے تھے کہ نیک بادشاہ جہاں سے گزرتا ہے ایسا لگتا ہے جیسے خزاں میں یکدم پھول کھل گئے ہوں۔ کہنے والے یہ بھی کہنے لگے تھے کہ یہ سب نیک بادشاہ کے نیک اعمال کا نتیجہ ہے۔ بادشاہ کو اب صاحبِ کرامات کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا اور اس سے رعایا کے حق میں دعا کروائی جاتی تھی۔

خود باس شاہی کا لفظ بھی عوام میں بڑا مقبول ہوگیا۔ لوگ اسے محاوروں اور مثالوں میں استعمال کرنے لگے تھے۔ مثلاً کسی کھانے کی تعریف کرنی ہو تو کہتے کہ کھانے سے ایسی خوشبو اُٹھ رہی ہے جیسے بادشاہ کے پیروں سے باس شاہی آ رہی ہو۔ خاص خاص موقعوں پر گھروں میں باس شاہی کوفتے، باس شاہی حلیم، باس شاہی پلاؤ، اور میٹھے میں باس شاہی ٹکڑے اور بالو باس شاہی بننے لگے۔ باس شاہی کے نام سے مہنگے، سستے، ہر طرح کے عطر فروخت ہونے لگے۔ اگر اُس زمانے میں ڈِزنی والے فلم بناتے تو کوما میں پڑی شہزادی کو باس شاہی سنگھا کر ہی جگایا جاتا!

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ملک کے طول و عرض میں وسعت آتی گئی اور نیک بادشاہ کا کام بڑھ گیا۔ اس نے محل سے نکلنا کم کر دیا۔ بس شاہی محل کے وسیع صحن میں چہل قدمی کر لیتا تھا۔ بادشاہ نے اب معاون وُزَرا بھی رکھ لیے تھے، جیسے وزیر زراعت، وزیر صنعت، وزیر تعلیم، وزیر صحت، وغیرہ۔

البتہ عوام کے دلوں میں نیک بادشاہ کے لیے وہی پہلے جیسی محبت باقی تھی اور باس شاہی سونگھنے کے شوق میں وہ اب بھی محل کے باہر جمع ہو جاتے تھے۔ کبھی بادشاہ کی جگہ کسی وزیر کی پالکی محل سے باہر نکلتی تو لوگ اُسے بھی کاندھوں پر سوار کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ اگرچہ اُن وزرا کے پیروں سے اُن وزرا کی ہی بو سونگھنے کو ملتی، لیکن چونکہ وہ شاہی اور اقتدار سے منسلک ہوتے تھے، اس لیے عوام کو ان کی بُو میں بھی باس شاہی کا کیف و سرور محسوس ہوتا تھا اور وہ اس میں بھی خیر و برکت تلاش کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ بادشاہ کی طرح اُن وزرا کے بھی ہاتھ، پیر، سر، گردن، بلکہ پورا بدن متبرک ہو گیا۔ مثلاً کبھی کسی پُل کی تعمیر مکمل ہوئی ہوتی یا کسی سڑک یا مدرسے کا افتتاح کروایا جاتا تو کتبے پر خاص طور پر لکھوایا جاتا کہ 'اس پُل کا افتتاح بدستِ مبارک جناب فلاں بن فلاں انجام پایا'!

باسْ شاہی کی تعریف

تو دوستو، یہ تھی لفظ باس شاہی کی کہانی۔ اب اس لفظ کی باقاعدہ تعریف کر لیتے ہیں۔

باس شاہی کے سادہ معنی تو پاؤں کی بُو کے ہیں، لیکن یہاں ایک بنیادی تفریق پائی جاتی ہے۔ اگر بُو عوام کی ہو تو اسے بُو یا باس یا کچھ اور نام دیا جائے گا۔ مگر شاہوں کی ہو تو باس شاہی کہلائے گی۔ شاہوں کی نہ ہو لیکن شاہی اور اقتدار سے منسلک ہو تو بھی باس شاہی

کہلائے گی۔ باس شاہی ایسی بُو ہے جس سے عوام مرعوب بھی ہوتے ہیں اور جس کے خرچے بھی اٹھاتے ہیں۔

مجازاً استعمال میں باس شاہی پاؤں کی بُو تک محدود نہیں ہے۔ اس میں بادشاہوں کے شاہانہ الفاظ و القاب، طور طریقے، ناز و نخرے، شوق و مشغلے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اور غور کریں تو شاہوں کی خامیاں، کوتاہیاں، اور بدعنوانیاں بھی باس شاہی کے زمرے میں آتی ہیں۔ بادشاہ ایسے کام کریں تو یہ انھیں زیب دیتا ہے۔ لیکن عوام مرتکب ہوں تو مجرم ٹھہرائے جائیں گے۔ کسی شاہ کو سزا بھی صرف دوسرا شاہ دے سکتا ہے۔ عوام کو اس کا تصور بھی ذہن میں نہیں لانا چاہیے۔ چناچہ جن معاشروں میں باس شاہی پھیلی ہوئی ہو وہاں حق و سچ اور عزّتِ نفس جیسی قدروں کے معیار بھی بدلے ہوئے ہوتے ہیں!

دوستو، یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض اوقات یہ بادشاہ لوگ خود بھی اپنی باس شاہی کے معتقد ہوتے ہیں۔ یعنی اس وہم اور دھوکے میں ہوتے ہیں کہ وہ عوام کے مقابلے میں واقعی کوئی امتیاز رکھتے ہیں۔ اور اس لیے اپنا حق سمجھ کر باس شاہی پھیلاتے ہیں۔ بعض تو یہ گمان بھی کرنے لگتے ہیں کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان فیض و برکت کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ ظلّ اِلٰہی اور عالم پناہ جیسے القاب بھی اختیار کرلیتے ہیں۔ لیکن چاہے وہ خود ایسی کسی بات کے معتقد ہوں یا نہ ہوں، عوام کے لیے معتقد ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ باس شاہی اقتدار سے حاصل بھی ہوتی ہے اور اقتدار کو دوام بھی دیتی ہے!

محاورے

دوستو، اب باس شاہی سے متعلق دو تین محاورے بھی ملاحظہ کر لیں۔

ا) **باس شاہی سنگھانا**: باس شاہی سنگھانے کے معنی ہیں دوسرے کو اپنی شاہی سے مرعوب کرنا، انھیں تابع فرمان بنانا، یا کم از کم ان پر اپنی طاقت و اقتدار کا اظہار کرنا۔

بادشاہت کا نظام ہمارے یہاں صدیوں قائم رہا اور باس شاہی سنگھانا درباری روایات کا بنیادی حصّہ تھا۔ پھر کولونیل دور آیا۔ انگریز سرکار نے بھی اپنے انداز میں شاہی اور باس شاہی دونوں کو فروغ دیا۔ بلکہ باقاعدہ 'دہلی دربار' لگایا جاتا تھا جس میں مقامی شاہوں، راجاؤں، اور نوابوں کو انگریز سرکار کی باس شاہی سنگھائی جاتی تھی۔ بعد میں یہی روایت افسر شاہی کے تربیتی نظام کا حصّہ بنی۔ بلکہ اسکولوں، دفتروں، تھانوں، ہسپتالوں، غرض کہ پورے معاشرے میں سرایت کر گئی۔ اس نظام کے پروردہ اپنے سے اوپر والوں کی باس شاہی سونگھنے اور نیچے والوں کو اپنی باس شاہی سنگھانے، دونوں کے بڑی شوقین ہوتے ہیں۔ البتہ استثنائی کیس بھی پائے جاتے ہیں (ایسے لوگ عموماً زیادہ ترقی نہیں کر پاتے)۔

۲) **باس شاہی چڑھ جانا/باس شاہی سانسوں میں بس جانا:** باس شاہی چڑھ جانے سے مراد شاہی سے مرعوبیت کی شدید کیفیت کا طاری ہونا ہے جو عارضی بھی ہوسکتی ہے اور دائمی بھی۔ مثال کے طور پر اس کیفیت میں عوام شاہوں کے لیے جلسے جلوس نکالتی ہے، ڈھول پیٹتی ہے، ناچتی گاتی ہے، ووٹ ڈالتی ہے، یہاں تک کہ مرنے مارنے پر بھی تیار ہوجاتی ہے!

باس شاہی چڑھ جانے کی دائمی مجذوبیت بھی لوگوں میں دیکھی گئی ہے۔ ایسے لوگوں کی سانسوں میں باس شاہی رچ بس چکی ہوتی ہے۔ جیسے کچھ لوگ آج بھی انگریز سرکار کے گُن گاتے ہیں اور حالات کو دیکھ کر خواہش کرنے لگتے ہیں کہ ہمیں دوبارہ سے کولونائز کر لیا جائے۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو بدبو کے طعنے دیتے ہیں لیکن انگریز سرکار کی بدبو کی بات آئے تو وہ باس شاہی بن جاتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے نظر آتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ گورا صاحب نے ہمیں کولونائز کیا، لیکن یہ بھی دیکھو کہ پورے خطے میں ٹرین کی پٹڑی بچھا

گیا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ گورا صاحب ہمیں 'اَن سویلائزڈ'[۱۸] کہہ کر گالی دیتا تھا، لیکن یہ بھی دیکھو کہ گالی انگریزی زبان میں دیتا تھا۔ اس لیے بُرا ماننے کے بجائے اپنے آپ کو سُدھارنے کی کوشش کرو، ورنہ ترقی کی ٹرین چھوٹ جائے گی۔ باس شاہی یوں سانسوں میں بسی ہو تو قوموں کو جبری کولونائز کرنے کی ضرورت نہیں رہتی!

تین اہم نکات

۱) دوستو، اب تک ہم نے لغوی تعریف اور محاوروں کی بحث کی جو اپنی جگہ اہم ہے لیکن سماجی رویےّ صرف لغوی بحث کرنے سے نہیں سمجھے جا سکتے۔ ماہرینِ سماجیات اصرار کرتے ہیں کہ باس شاہی کی مقبولیت کے پیچھے فقط مرعوبیت کا عنصر نہیں ہوتا۔ مثلاً ممکن ہے کسی پر بظاہر باس شاہی چڑھی ہوئی ہو اور وہ جلسے میں زور زور سے ڈھول پیٹ رہا ہو، لیکن پیچھے مرعوبیت سے زیادہ وقتی حالات اور مفادات کا اثر ہو۔ کچھ اور نہیں تو شاہوں کے جلسوں میں جا کر شُغل ہوجاتا ہے اور بریانی کی پلیٹ اور دن بھر کا ہدیہ وغیرہ مل جاتا ہے!

۲) ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شاہی اور باس شاہی دونوں کو سمجھنے کے لیے زمانے کی تبدیلیاں بھی نگاہوں کے سامنے رہیں۔ مثلاً اب جمہوریت کا دور ہے۔ اب عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ دی گئیں چوئسس میں سے خود انتخاب کریں کس کی باس شاہی کو سونگھنا پسند کریں گے!

۳) شاہی کے ہمارے ثقافتی شعور پر گہرے اثرات کے ضمن میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ لوگ خدا کے نیک، برگزیدہ بندوں کو عقیدت میں شاہ اور بادشاہ کہنے لگتے ہیں۔ اس لفظی استعمال کو کیسے دیکھا جائے؟ ایک رائے یہ ہے کہ صرف ایسے نیک، برگزیدہ بندے اس

---

[۱۸] Uncivilized

لائق ہیں کہ انھیں شاہ اور بادشاہ کہا جائے۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ خدا کے ان نیک بندوں کا مرتبہ اس سے کہیں بلند ہے کہ انھیں دنیا کے بادشاہوں سے تشبیہ دی جائے۔ کیونکہ دنیا کے بادشاہ چاہے نیک ہوں یا ظالم، سب ہی عوام کے کاندھوں پر سوار ہوتے ہیں اور سب ہی سے باس شاہی آتی ہے!

تو دوستو، امید ہے اب باس شاہی کا لفظ آپ کے لیے ناشناسا نہیں رہا ہوگا۔ اس کا مفہوم، پس منظر، اور استعمال بھی واضح ہوگیا ہوگا۔ آپ لوگ چاہیں تو اس مذاکرے میں 'باس شاہی' کو زیرِ بحث لا سکتے ہیں۔ چاہیں تو اس طرح کے دوسرے نئے پرانے الفاظ سامنے لے آئیں۔ ایسے الفاظ جو مستند ہوں اور تنقیدی شعور کی آبیاری کریں، اگرچہ کم سنے گئے ہوں!

ایک بار پھر اس ادبی محفل میں مدعو کرنے کا بہت شکریہ!

حصّہ دوم

شور ہی شور

(تیز زندگی)

ہر طرف شور ہی شور ہے

اتنا شور کہ

اپنے اندر کی آواز بھی

سنائی نہیں دیتی

اُونچے ہارن کا شور

ریس لگاتی بسوں کا شور

دروازے پر بے صبری گھنٹی کا شور

دن رات بجتے فون کا شور

آتے جاتے میسجز کا شور

ہر طرف شور ہی شور ہے

اتنا شور کہ

باہر کی طرح

اندر بھی

شور ہی شور سنائی دیتا ہے

بلکہ شور نہ ہو تو

خالی خالی سا لگتا ہے
لیکن اِس شور میں
اندر کی آواز
کہیں دب جاتی ہے
اور کہیں
یہ بات بھی
اندر ہی
نہ دب جائے

پانچ کونوں والی
(گھریلو بول چال)

دروازے کی گھنٹی زور سے بجی۔ امّی فوراً اٹھیں اور جا کر دروازہ کھولا۔ ننھّا راوی دوڑتا ہوا داخل ہوا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا آیا تھا، اس لیے سانس پھولی ہوئی تھی۔

راوی سیدھا کچن کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ روز اسکول سے آ کر اسی کرسی پر بیٹھتا تھا اور اپنے پلے گروپ کی ساری خبریں سناتا تھا۔

امّی نے پانی کا گلاس راوی کے سامنے رکھا اور خود برابر میں کرسی پر بیٹھ گئیں۔

مگر راوی نے پانی نہیں پیا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ ہی بولنا شروع کردیا،

'وہ مِس۔۔۔ ستارہ۔۔۔' راوی اتنا کہہ کر ہانپنے لگا۔

امّی سوچنے لگیں، 'اب یہ کون سی نئی مِس آگئی ہے۔ میں تو تنگ آگئی ہوں ان اسکول والوں سے۔ ہر مہینے ٹیچر بدل دیتے ہیں۔ بچّے کتنا ڈسٹرب ہو جاتے ہیں!'

امّی راوی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں، 'راوی، پہلے سانس لے لو۔ پانی پی لو۔ پھر خبر سنا دینا۔'

مگر راوی کو تو جلدی تھی۔ پھر ہانپتے ہوئے بولا، 'وہ مِس۔۔۔ پانچ کونوں والی۔۔۔'

'ھیں ں ں۔۔۔ اس مِس کے پانچ کونے ہیں؟' امّی نے سوچا، 'اوپر سے نام بھی ستارہ رکھا ہوا ہے! کیسی عجیب عجیب باتیں ہورہی ہیں اس زمانے میں!'

بالآخر راوی کی سانس کچھ بحال ہوئی تو بات پوری کہی،

'وہ آج مِس کلاس میں۔۔۔ پانچ کونوں والی۔۔۔ ستارہ مچھلی دکھانے لائی تھیں!'

'اوہو۔۔۔' امّی نے دل میں کہا، 'میں بھی کیا سے کیا سوچنے لگتی ہوں!'

پھر راوی کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں، 'راوی! کتنی بار کہا ہے آ کر پہلے پوری سانس لیا کرو، پھر بات کیا کرو!'

مگر راوی تو اپنی خبر سنا چکا تھا اور اب سکون سے پانی پی رہا تھا۔

نام کا مسئلہ

(بچّوں کے تاریخی نام)

(ایک چھوٹے سے کمرے میں لکڑی کے کئی بک شیلف ہیں جن میں کتابیں ہی کتابیں دکھائی دے رہی ہیں۔ میز کے پیچھے ایک خستہ حال، گھومنے والی کرسی پر ڈاکٹر صاحب بیٹھے ہیں۔ اُن کے سامنے ایک نوٹ پیڈ اور قلم پڑا ہے۔ میز کی دوسری جانب، ایک سادہ سی کرسی پر محمود صاحب بیٹھے ہیں۔ اُن کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہیں۔ یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے وہ مریض ہوں اور ڈاکٹر صاحب کے پاس علاج کرانے کے لیے آئے ہوں۔)

محمود صاحب: جی ڈاکٹر فہیم نے آپ کا حوالہ دیا تھا۔ کہا تھا کہ آپ اُن کی طرح نفسیات کے ڈاکٹر نہیں ہیں، تاریخ کے ڈاکٹر ہیں، پی ایچ ڈی ہیں، لیکن میرے مسئلے کا حل شاید آپ بتا سکیں؟

ڈاکٹر صاحب: جی جی، میں ڈاکٹر فہیم کو ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ بلکہ انھیں کون نہیں جانتا۔ مشہور شخصیت ہیں۔ دیکھیں اب اِسپشلائزیشن کا دور ہے۔ آنکھ کا الگ اسپشلسٹ ہوتا ہے، دل کا الگ، گُردے کا الگ۔ ایک اِسپشلسٹ اپنی اسپشلائزیشن سے باہر دوسرے مرض کو نہیں دیکھتا، بلکہ ریفر کر دیتا ہے۔ اسی طرح ذہنی الجھنیں بھی طرح طرح کی ہوتی ہیں اور ہر ذہنی الجھن کا حل ماہر نفسیات کے پاس نہیں ہوتا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ہمارے یہاں ماہر نفسیات کا چرچا زیادہ ہے۔ فیس بھی ان کی زیادہ ہوتی ہے۔ مورننگ شوز وغیرہ میں بھی انھیں ہی بلایا جاتا ہے۔ خیر میں خود بھی ایسے شوز میں نہیں جاتا۔ بس یہ

پرائیوٹ پریکٹس چلا رکھی ہے۔ ورنہ کالج میں پڑھانے کے بعد تو بڑی مشکل سے وقت ملتا ہے۔

محمود صاحب: جی آپ کا وقت قیمتی ہے۔ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔

ڈاکٹر صاحب: ارے نہیں نہیں، آپ کی خدمت کے لیے موجود ہیں۔ فرمائیے؟

محمود صاحب: شکریہ۔ آپ شاید اس بات سے اتفاق کریں گے کہ نام کا اثر ہوتا ہے۔ شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔ بلکہ ذات کا حصہ بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: جی جی۔

محمود صاحب: ڈاکٹر صاحب، اس لیے اب مجھے اپنا نام پسند نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب: اوہ۔۔۔ اچھا! معاف کیجیے گا، میں نے آپ کا نام پوچھا ہی نہیں۔ پہلے یہی پوچھنا چاہیے تھا۔

(ڈاکٹر صاحب اپنا قلم اٹھاتے ہیں اور نوٹ پیڈ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں۔)

محمود صاحب: جی میرا نام محمود غزنوی ہے۔

(ڈاکٹر صاحب سر اٹھا کر محمود صاحب کی طرف دیکھتے ہیں۔)

ڈاکٹر صاحب: یہ تو مشہور نام ہے، اس میں کیا مسئلہ ہوگیا ہے؟

محمود صاحب: جی مجھے پہلے اپنا نام بہت پسند تھا۔ محمود غزنوی میرے لیے ایک ہیرو کی طرح تھا۔ ایک ولی اللہ تھا۔ اللہ کا خالص بندہ۔ اللہ کی راہ میں خالص جہاد کرنے والا۔ بے کسوں کی داد رسی کرنے والا۔ ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے والا۔ اُس کے دل میں مالِ غنیمت کی لالچ تھی نہ طاقت و سلطنت کی خواہش۔ فقط شہادت کی تمنا تھی۔ لیکن پھر کچھ دن پہلے سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ دیکھی۔ بہت عجیب لگی۔ کئی سوال ذہن میں ابھر

آئے۔ میں نے انٹرنیٹ پر مزید ڈھونڈا تو اندازہ ہوا کہ محمود غزنوی درحقیقت ایک جنگجو تھا۔ اُن سلاطین اور فاتحین میں سے تھا جو انڈیا پر حملہ کرتے تھے۔ خون بہاتے تھے۔ مال و زر لوٹ کر لے جاتے تھے۔ اور سومنات میں بھی یہی کچھ ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب (کچھ بڑبڑاتے ہوئے): ھم م م، آپ نے بورڈ کے نصاب سے زیادہ تاریخ پڑھ ڈالی، سائڈ افیکٹ تو ہونا تھا۔

محمود صاحب: جی کچھ فرمایا۔۔۔؟

ڈاکٹر صاحب: اخم م م۔۔ محمود صاحب، نام تو ہمارے والدین رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے اچھی نیّت سے رکھتے ہیں۔

محمود صاحب: جی، لیکن اب یہ تاریخی حقیقت بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں الجھن کا شکار ہوگیا ہوں۔ کیا میں 'محمود غزنوی' ہوں؟ اگر نہیں، تو میں کون ہوں؟ میں اپنی ذات کا نشان کہاں تلاش کروں؟ کیا میں اپنا نام بدل ڈالوں؟ ڈاکٹر صاحب، آپ تو جانتے ہیں ہمارے معاشرے میں نام بدلنا آسان نہیں۔ گھر والوں اور رشتہ داروں کو کیا جواب دوں گا۔ شناختی کارڈ، تعلیمی اسناد، سرکاری کاغذات وغیرہ، سب بدلوانا ایک عذاب ہو جائے گا۔ مجھے تو یہ فکر بھی لاحق ہے کہ نام کے بدلنے سے میں خود کتنا بدل جاؤں گا۔ جب اپنے نئے شناختی کارڈ کو دیکھوں گا، تو کیا اپنے آپ کو پہچان پاؤں گا؟ آپ سمجھ رہے ہیں نا، یہ معاملہ نفسیاتی، سماجی، ہر لحاظ سے کس قدر گمبھیر ہے۔

ڈاکٹر صاحب: ھم م م، میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔۔۔ ایک منٹ ٹھہریں۔۔۔ شاید۔۔۔

(ڈاکٹر صاحب میز کی دراز کھولتے ہیں، ایک ڈائری باہر نکالتے ہیں اور ورق گردانی کرنے لگتے ہیں۔ محمود صاحب ڈاکٹر صاحب کی جانب دیکھ رہے ہیں۔)

ڈاکٹر صاحب (سر اٹھاتے ہوئے): جی ایک بات ذہن میں تھی لیکن میں اپنے نوٹس سے کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔ محمود صاحب، ہم شاید اس معاملے کو کسی حد تک سلجھا سکیں۔

محمود صاحب (پُر امید لہجے میں): جی جی، ڈاکٹر صاحب بتائیے!

ڈاکٹر صاحب: محمود صاحب، جہاں تک سومنات کے واقعے کا تعلق ہے، حالیہ تحقیق نے اس کی تاریخی صداقت پر کئی سوال اٹھائے ہیں۔یعنی وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ واقعہ پیش بھی آیا تھا۔ یا پیش آیا تھا تو انھی تفصیلات کے ساتھ جو کہ مشہور ہیں۔

محمود صاحب (خوشی سے): یعنی محمود غزنوی جنگجو نہیں، واقعی ولی اللہ تھا؟

ڈاکٹر صاحب: ارر--- دیکھیں، محمود صاحب، ہم اس حد تک تو سوال اُٹھا سکتے ہیں کہ سومنات کے واقعے کی کوئی معتبر سند، کوئی تاریخی صداقت ہے بھی کہ نہیں۔ البتہ آپ کے نزدیک جو ولی اللہ کی تعریف ہے، وہ پھر بھی ثابت نہیں ہوتی۔ کم از کم معتبر تاریخ سے ثابت کرنا مشکل ہے۔ جس طرح اُس زمانے میں دوسرے فاتحین و سلاطین ہوا کرتے تھے، محمود غزنوی بھی کم و بیش اسی طرح تھا۔

محمود صاحب: ڈاکٹر صاحب، پھر بھی کوئی تو راہ ہوگی---؟

ڈاکٹر صاحب: راہ---؟ دیکھیں محمود صاحب، آپ دل کے سچے آدمی ہیں، مخلص ہیں، ورنہ آج کل ان باتوں کی کون پروا کرتا ہے۔ میں نہیں کہتا میں دودھ کا دُھلا ہوں، لیکن معتبر ذرائع سے کوئی راہ نکالنا مشکل ہے۔ وہ ابن انشا نے اپنی کتاب میں کہا تھا نا کہ--- 'بعض بادشاہوں کا احوال ہمیں اولیا اللہ کے باب میں لکھنا تھا لیکن بادشاہوں میں لکھ گئے۔ اس میں ہماری نیت کا قصور نہیں، تاریخی واقعات کا قصور ہے'--- بس، محمود صاحب، یہاں بھی یہی مجبوری ہے!

محمود صاحب: جی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ مجھے بھی تاریخی صداقت پر مبنی راہ کی تلاش ہے، فرضی بیانیوں پر نہیں۔ نام کا مسئلہ تو شعورِ ذات اور تکمیلِ ذات سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے لیے سچے ولی اللہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جو واقعی بلند پایہ اور باعظمت ہو، نہ جسے طاقت و اقتدار نے باعظمت بنا دیا ہو اور نہ فرضی تاریخ لکھنے والوں نے۔ ڈاکٹر صاحب، یعنی اب نام بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔۔۔؟

ڈاکٹر صاحب: 'محمود' کے نام سے اچھے لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ آپ بھی کئی لوگوں سے واقف ہوں گے۔

محمود صاحب: جی، لیکن یہاں 'محمود' اور 'غزنوی' دونوں ساتھ ملا کر ہیں۔ ایک تاریخی شخصیت کا نام بن جاتا ہے۔ اس کے اپنے اثرات ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: آپ کا نام بھی 'محمود غزنوی' ہے، آپ تو ماشاء اللہ خاصا درد اور شعور رکھنے والے ہیں۔ اپنے بچّوں کے ناموں میں احتیاط کر لیجیے گا۔

محمود صاحب: ڈاکٹر صاحب، اب تو وہاں بھی مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ میں ایک دوسری شخصیت کو بھی ولی اللہ سمجھ رہا تھا اور اس کے نام کو اپنی نسل میں دیکھنا چاہتا تھا، لیکن وہ بھی جنگجوؤں میں سے نکلا۔ میں نے اپنے بیٹے کا نام قاسم رکھا ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا۔۔۔؟

ڈاکٹر صاحب: اوہ اوہ۔۔۔ تاکہ اُس کا بیٹا 'محمد بن قاسم' بن سکے۔ ماشاء اللہ آپ دور کی نگاہ رکھتے ہیں!

محمود صاحب: جی قاسم تو بڑا اچھا نام ہے۔ اور محمد تو بہت ہی بابرکت نام ہے۔ لیکن 'محمد بن قاسم' ایک تاریخی شخصیت کا نام بن جاتا ہے۔ یہ لامحالہ اثر ڈالے گا۔ آپ تو جانتے ہیں

بچّے اپنے ناموں سے وابستہ شخصیات کو اپنا آئیڈیل بنا لیتے ہیں۔ ان کے جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو میرے کسی بچّے کے ہاتھوں کسی غریب، کسی مظلوم کا حق پامال ہوجائے۔ خیر، اس کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔ ابھی معاملہ بگڑا نہیں ہے۔ لیکن میں اپنے نام کا کیا کروں؟

ڈاکٹر صاحب: میں نے آپ کے سامنے اپنی ناچیز رائے پیش کر دی ہے۔ کوئی نئی تحقیق سامنے آجائے تو الگ بات ہے ورنہ---

(ڈاکٹر صاحب بات کرتے کرتے رک جاتے ہیں اور کچھ سوچنے لگتے ہیں۔)

ڈاکٹر صاحب (کچھ لمحوں کے بعد): محمود صاحب، آپ نے فرمایا تھا کہ نام تبدیل کرنا آپ کے لیے نفسیاتی و سماجی مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ آپ ماہر نفسیات سے مل چکے ہیں، چاہیں تو کسی ماہر سماجیات سے بھی مشورہ کر لیں۔ یہ لوگ گروہی اور معاشرتی سطح پر تجزیہ کرتے ہیں۔ اور تاریخ کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ مثلاً تاریخ معاشروں پر کیسے اثرانداز ہوتی ہے۔ کسی قوم کی شناخت اور شعور کو کیسے تشکیل دیتی ہے۔ تاریخ کو کیسے ڈھالا اور اپنایا جاتا ہے۔ اور ان ممکنہ اثرات کے ہوتے ہوئے ایک فرد اپنی ذات اور پہچان کو کیسے درک کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی ماہر سماجیات آپ کے کیس میں مدد کر سکے۔

محمود صاحب: جی آپ کسی کو جانتے ہیں---؟

ڈاکٹر صاحب (سوچتے ہوئے): ھم م م --- جی میں ایک صاحب کو جانتا ہوں۔ کہیں پڑھاتے ہیں۔ کہانیاں وغیرہ بھی لکھتے ہیں۔ میری طرح پرائیوٹ پریکٹس تو نہیں کرتے لیکن آپ چاہیں تو میں وقت لے سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ صاحب آپ کے مسئلے کو سمجھ سکیں گے، خاص طور پر نام کے بدلنے سے متعلق آپ کو جو خدشات ہیں۔ جس طرح قومیں اپنے آپ کو حکایات و تاریخ کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں، اسی طرح ایک فرد بھی

اپنی زندگی کے تجربات کو کہانی کے سانچے میں ڈھال کر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صاحب کچھ اور نہیں تو شاید یہی بتا سکیں کہ نام کی تبدیلی کے بعد آپ اپنی زندگی کی کہانی کو دوبارہ کیسے لکھیں، خاص طور پر ان اعلیٰ معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے جن کی جانب آپ نے اشارہ کیا ہے۔

محمود صاحب: یہ تو بہت مفید ہوسکتا ہے! جی بالکل، ڈاکٹر صاحب، آپ اگر ان سے وقت لے سکیں تو میں شکر گزار ہوں گا! بدن کی بیماری کا علاج کرانے کے لیے لوگ مارے مارے پھرتے ہیں، یہاں تو شعورِ ذات اور تکمیلِ ذات کا معاملہ ہے جو اور بھی اہم ہے۔ نام کا مسئلہ حل نہ ہوا تو زندگی اب تک جس ڈگر پر چلتی آئی ہے، کہیں ایسے ہی چلتے چلتے نہ گزر جائے!

ڈاکٹر صاحب: بہت بہتر، میں معلوم کرتا ہوں۔ اچھا، محمود صاحب، فیس کے مرحلے سے پہلے یہ بتا دوں کہ میرے یہاں دوائی تو نہیں ہوتی لیکن کوئی تاریخی حوالہ لینا چاہیں گے؟

محمود صاحب: جی--- وہ آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے ابن انشا کا ذکر کیا تھا؟

ڈاکٹر صاحب: اوہ ہاں--- لیکن ابن انشا کے استعمال سے تو مرض کے بگڑنے کا خدشہ ہے!

محمود صاحب: ڈاکٹر صاحب، میں اب اس معاملے میں پیچھے نہیں ہٹوں گا، بس یوں سمجھ لیں کہ میں نے ساری کشتیاں جلا دی ہیں!

ڈاکٹر صاحب (کچھ بڑبڑاتے ہوئے): 'ساری کشتیاں جلا دی ہیں'--- ہم م م --- محمود صاحب، آپ ابن انشا کو لے لیجیے۔ ہاں رِسک بہرحال رہے گا۔

(ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر نوٹ پیڈ پر لکھنے لگتے ہیں اور ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کرتے ہیں۔)

ڈاکٹر صاحب: آپ شاید خیال کر رہے ہیں کہ ابن انشا کی تاریخ پر کوئی کتاب ہے جہاں سے میں نے وہ قول نقل کیا تھا۔ لیکن دراصل وہ ایک ادبی تحریر ہے جس کا نام 'اردو کی آخری کتاب' ہے۔ طنز و مزاح کا اُسلوب ہے۔ البتہ تاریخ اور تاریخ نویسی، دونوں سے متعلق ایک تنقیدی فکر دیکھی جا سکتی ہے جو نصاب کی کتابوں میں مشکل سے ملے۔ اُن سے پہلے پطرس بخاری کے یہاں بھی اس طرح کی تحریر کے کچھ آثار نظر آتے ہیں، مثلاً ان کے مضامین، 'لاہور کا جغرافیہ' اور 'اردو کی آخری کتاب' وغیرہ۔ پطرس بخاری سے پہلے چراغ حسن حسرت کی کتاب 'جدید جغرافیہ پنجاب' بھی موجود ہے۔ اور اسی طرح دوسرے حوالے بھی مل جائیں گے۔ لیکن ابن انشا کی 'اردو کی آخری کتاب' خاصی موزوں رہے گی۔

(یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب اپنے نوٹ پیڈ کے کونے سے صفحے کو انتہائی احتیاط سے پھاڑتے ہیں اور محمود صاحب کی جانب بڑھاتے ہیں۔)

ڈاکٹر صاحب: بس آپ پوری کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھنے سے گریز کیجیے گا، کہیں اوور ڈوز نہ ہوجائے۔ اور ہاں میں نے محمود غزنوی سے متعلق بھی کچھ تاریخی حوالے لکھ دیے ہیں، اگر آپ دیکھنا چاہیں۔

محمود صاحب (صفحے کو لیتے ہوئے): جی بہت شکریہ، ڈاکٹر صاحب!

حلقہ

(آرٹ اینڈ کرافٹ)

(ایک ہائی اینڈ[19] اسکول کے اسٹاف روم میں، سیکنڈری سیکشن کی کوآرڈینیٹر مِس ثنا اور آرٹ ٹیچر مِس عارفہ کے درمیان میٹنگ ہو رہی ہے۔ مِس عارفہ کسی یونیورسٹی میں مشرقی فلسفہ و حکمت اور ویژول آرٹس کی طالبہ ہیں۔)

مِس ثنا: ہماری اگلی سرگرمی کے لیے مجھے کئی آئیڈیا موصول ہوئے۔ لیکن آپ نے حلقہ آرٹ کے نام سے جو ڈِزائن بھیجے تھے وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ کچھ کچھ مہندی کے ڈزائن جیسے ہیں۔ ہاں 'حلقہ آرٹ' کے نام سے دیں گے تو لڑکیاں ہی نہیں، لڑکے بھی کر لیں گے! ویسے یہ حلقہ آرٹ کیسے کیا جائے گا۔۔۔؟

مِس عارفہ: حلقہ تو بہت دلچسپ اور بامعنی آرٹ ہے۔ ہم اس میں رنگ برنگی مٹی کا استعمال کریں گے۔ 'حلقہ' کا مطلب دائرہ ہے۔ ہم ایک بڑا دائرہ بنائیں گے اور اس میں مٹی سے سادہ لیکن دیدہ زیب ڈزائن بنائیں گے۔ جمنیزیم میں خاصی جگہ ہے، وہاں اسے گروپ ایکٹیوٹی کے طور پر کرسکتے ہیں۔ اگر مٹی کے ساتھ کام کریں تو دو، تین دن لگیں گے۔ رنگا رنگ سنگ ریزوں کے ساتھ کام کریں تو آدھا دن تو لگے گا۔ اس آرٹ کی خاص بات یہ ہوگی کہ جیسے ہی یہ مکمل ہوگا، آرٹسٹ اسے برش لے کر خود مٹا دے گا۔

مِس ثنا (حیرت سے): ہائیں۔۔۔مٹا دے گا؟ یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی محنت سے بنائیں گے، اسے تو ہمیں پورے اسکول کو دکھانا چاہیے! بلکہ پیرنٹس کے لیے ایکسبیشن کرنا چاہیے!

---

[19] High-end

مِس عارفہ: مِس ثنا، مٹانے کے پیچھے علامتی یاد دہانی ہے کہ ہم اپنے دل کو دنیا سے نہ جوڑ لیں۔ اور دنیا کے ظاہر کو کُل حقیقت نہ سمجھ بیٹھیں۔ حلقہ میں جب ظاہری صورتیں مٹتی ہیں تو پیچھے مٹی رہ جاتی ہے۔ صرف اسی پر غور کرتے جائیں تو دنیا کی حقیقت دل پر کُھلنے لگتی ہے۔ یعنی ظاہری صورتوں کا مٹی سے کیا تعلق ہے، مٹی کا دائرے سے، دائرے کا تخیّل سے، وغیرہ وغیرہ۔ غالبؔ نے بھی تو اشارہ کیا ہے نا:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ / عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

البتہ یہاں حلقہ آرٹ کا آئیڈیا کہیں اور سے لیا گیا ہے۔ تبت، انڈیا، لاطینی امریکہ وغیرہ میں مختلف تصوّرات اور انداز کے ساتھ رنگ برنگے دائرے بنائے جاتے ہیں۔ اور بعض جگہوں پر اسے بناتے ہی مٹا دیا جاتا ہے، جو بنانے والوں اور دیکھنے والوں، سب پر گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔

مِس ثنا: یہ سب صحیح ہے، لیکن کیا ضروری ہے اپنی تخلیق کو اپنے ہاتھوں سے مٹا کر یہ علامتی سبق دیا جائے؟ کیا ایسا نہیں کر سکتے کہ ہم حلقہ بنائیں، لیکن مٹائیں نہ---؟

مِس عارفہ: مس ثنا، حلقہ آرٹ کے پیچھے تربیت کی ایک گہری سائنس ہے۔ علامتی عناصر کے ساتھ ساتھ بدن اور روح کے باہمی تعلق کو سمجھا گیا ہے۔ جس طرح ایک آرٹسٹ اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار باہر آرٹ کی تخلیق میں کرتا ہے، اسی طرح بیرونی عمل کا اثر اندرونی کیفیت پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً اپنے ہاتھ سے بنی تخلیق کو اپنے ہی ہاتھوں سے مٹائیں تو اثر ہے، دیوار پر سجائیں تو اثر ہے، لوگوں سے داد لیں تو اثر ہے، داد نہ لیں تو اثر ہے۔ جب اپنی تخلیق کو اپنے ہی ہاتھوں سے مٹایا جائے تو دل کو سمجھانا پڑتا ہے۔ ضبطِ نفس سکھانا پڑتا ہے۔ یوں اندر کے انسان کی تربیت ہو رہی ہوتی ہے۔ گہرائی آ رہی ہوتی ہے۔ حلقہ میں

اصل آرٹ تو آرٹسٹ کے اندر تخلیق پا رہا ہوتا ہے، حلقہ بناتے ہوئے بھی اور مٹاتے ہوئے بھی۔ اور اس لحاظ سے حلقہ بھی حکمت کے فنون کی طرح ہے۔

مِس ثنا: لیکن مس عارفہ، اس سے پہلے ہم نے روایتی خطاطی بھی کروائی تھی۔ وہ بھی تو حکمت کے فنون کی طرح ہے۔ اس میں بھی قلبی تمرکز، تہذیب نفس وغیرہ سب شامل ہوتا ہے۔ لیکن وہاں تو اپنی تخلیق کو یوں مٹایا نہیں جاتا۔۔۔؟

مِس عارفہ: جی مس ثنا، خطاطی کے پیچھے اپنا گہرا فلسفہ ہے اور اسی حساب سے اس کی پیڈاگوجی ہے۔ حلقہ کی اپنی پیڈاگوجی ہے۔ اور خطاطی کی طرح حلقہ میں بھی بچّوں کی قابلیتوں اور نُمو کو سامنے رکھا گیا ہے۔

مِس ثنا: لیکن پھر بھی، کسی آرٹ کو یوں مٹایا تو نہیں جانا چاہیے۔ آرٹ تو انسان کی تخلیقی اور تعمیری فطرت کا اظہار ہے۔ انسان نے اسی مٹی سے برتن اور مکان بنائے ہیں، شاہراہیں اور گلستان تعمیر کیے ہیں۔ یہ سب بھی تو آرٹ ہے۔ آرٹ سے تو تہذیب و ثقافت میں پیشرفت ہوئی ہے۔ ہمیں تو اپنے آرٹ کو سیلبریٹ[۲۰] کرنا چاہیے۔ یوں مٹا دینا تو منفی رجحان کو فروغ دینا ہوگا۔

مِس عارفہ: جی، لیکن حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے مٹی کے برتن، مکان، شاہراہیں، گلستان، سب ایک دن بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔ نیچے کی مٹی ظاہر ہوجاتی ہے۔ حلقہ آرٹ میں بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ کوئی منفی بات تو نہیں۔

مِس ثنا: مِس عارفہ، مٹی کے برتن خود سے ٹوٹ جائیں تو یہ نیچرل عمل ہے، لیکن اپنے ہاتھوں سے توڑے تو نہیں جاتے۔ ہم دنیا میں صرف مرنے کے لیے تو نہیں بھیجے گئے

---

[۲۰] Celebrate

ہیں، جینے کے لیے بھی بھیجے گئے ہیں۔ خلیفہ بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آرٹ کی تخلیق میں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ یوں اپنے آرٹ کو خود مٹا دینا تو بہت ڈپریسنگ ہوجائے گا۔

مِس عارفہ: مس ثنا، اس دنیا میں بھی جینا ہے اور بعد میں بھی جینا ہے۔ اور ضروری تو نہیں کہ اپنی تخلیق کو مٹا دینا ڈپریسنگ ہی ہو۔ بچّے کھیلتے ہوئے مٹی کے گھروندے بناتے ہیں۔ ان سے دل بھی لگاتے ہیں۔ جبکہ وہ جانتے ہیں کہ گھروندوں نے ٹوٹ جانا ہے اور انھیں بھی واپس اپنے گھر چلے جانا ہے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھر جاتے ہوئے وہ خود ہی انھیں توڑ دیتے ہیں۔ لیکن ڈپریس تو نہیں ہوتے۔ ہاں کوئی بچّہ اس کھیل ہی کو حقیقت سمجھنے لگے تو مشکل ہوجاتی ہے۔

مِس ثنا: پھر بھی اتنی محنت کے بعد یوں اپنے کام کو مٹا دینے سے دل تو دُکھے گا۔ ہمیں اپنے بچّوں کا دل تو نہیں دُکھانا ہے۔ آرٹ کو تو فَن ہونا چاہیے۔ بچّوں کو اِنجوئے کرنا چاہیے۔ کچھ تو حل نکالیں، مس عارفہ! ہم حلقہ بنائیں، لیکن مٹائیں نہ!

مِس عارفہ: ام م م۔۔۔ ہم چاہیں تو بچّوں کو ساحلِ سمندر لے جاسکتے ہیں۔ وہاں ریت، کنکر وغیرہ کو استعمال کرتے ہوئے حلقہ بنائیں گے۔ کوشش کریں گے کہ دوپہر تک پورا کر لیں۔ پانی بالآخر حلقہ کو بہا لے جائے گا۔ شاید ہمارے سامنے ہی بہا لے جائے، شاید ہمارے جانے کے بعد۔

مِس ثنا: اوہ۔۔۔ یہ انتہائی دلچسپ ہوگا! پکنک بھی ہوجائے گی۔ بچّوں کا دل بھی نہیں دُکھے گا۔ انھیں شروع سے پتا ہوگا کہ ساحل پر بنائے گئے نقش دیرپا نہیں ہوتے۔ اور گھر لے جانے کا تو سوال ہی نہیں! ہاں، تصویر تو لے سکیں گے نا۔۔۔؟

مِس عارفہ: ام م م۔۔۔ اگر لینا چاہیں تو کیا کہہ سکتے ہیں۔

مِس ثنا: ہاں، یادوں میں تو رہے! ہم سوشل میڈیا پر بھی ڈال سکیں گے۔ اور سالانہ میگزین میں بھی۔ بلکہ میگزین کا سرورق بن سکتا ہے۔ گہرا تاثر جائے گا! چلیں طے ہوگیا! حلقہ آرٹ ہوگا اور ساحل سمندر پر ہوگا! مزا آئے گا! آپ سرکُلر تیار کر لیں۔ متن پہلے دکھا دیجیے گا۔ باقی انتظامات میں دیکھ لوں گی!

مِس عارفہ: جی میں تیار کرتی ہوں۔

مِس ثنا: متن ضرور دکھا دیجیے گا!

مِس عارفہ: جی جی، ضرور!

گِننا اور تولنا

(گنتی کا قاعدہ)

(ایک ہائی اسکول کے اسٹوڈنٹ کلب میں پریزنٹیشن دی جا رہی ہے۔)

دوستو، ہمارے کلب، ریاضی پلس، میں آپ سب کو خوش آمدید! میرا نام آمَل ہے اور میں اس کلب کی فاؤنڈنگ ممبران میں سے ہوں۔ نئے تعلیمی سال کا آغاز ہے۔ مجھے کچھ نئے چہرے بھی نظر آ رہے ہیں۔ آپ کو خاص طور پر خوش آمدید!

ہمارے نئے شرکا کے ذہنوں میں ریاضی سے متعلق یقیناً کچھ تصوّرات ہوں گے اور ممکن ہے آج کی پریزنٹیشن توقعات سے کچھ ہٹ کر ہو۔ لیکن چلیں اسی بہانے ہمارے کلب کا تعارف بھی ہوجائے گا! خاص طور پر یہ کہ ہم نے اپنے کلب کا نام ریاضی پلس کیوں رکھا ہے۔ ہاں یہ قطعاً لازم نہیں کہ آپ پیش کیے گئے تمام نکات سے اتفاق کریں۔ پریزنٹیشن کے آخر میں اپنی آرا ضرور شیئر کیجیے گا!

دوستو، ریاضی ہمیں ہر جگہ نظر آتی ہے، خاص طور پر جب ہم جیومیٹری کو بھی سامنے رکھیں۔ ہم اپنے اطراف میں نظر آنے والی تقریباً ہر شے کو گِن سکتے ہیں، اس کی پیمائش کرسکتے ہیں، زاویے وغیرہ دریافت کر سکتے ہیں، اور ان ساری معلومات کو استعمال میں لا سکتے ہیں۔ مثلاً آپ نے سنا ہوگا کہ مین ہول یا گٹر کے ڈھکن کو خاص طور پر گول شکل کا بنایا جاتا ہے۔ چوکور کیوں نہیں؟ کوئی بتائے گا؟

(حاضرین میں سے کچھ جواب آتے ہیں۔)

جی بالکل! گول ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ ڈھکن گٹر کے اندر نہیں گرتا۔ ذہن میں لائیں کہ اگر گٹر چوکور شکل کا بنا ہو اور اُس کا ڈھکن بھی چوکور شکل کا ہو اور وہ ڈھکن ترچھا ہو کر نیچے گرے، تو اندر چلا جائے گا۔ جب کہ گول گٹر کے حساب سے جو گول ڈھکن بنایا جاتا ہے وہ کسی بھی زاویے سے گھومے، اندر نہیں جائے گا۔

یہ تو ایک مثال تھی لیکن آپ جانتے ہیں کہ ریاضی کے استعمال سے ہم نے سائنس، ٹیکنولوجی، طب، اور دیگر علوم میں کیا کیا پیشرفت نہیں کی ہے۔ ریاضی تو اُن بنیادی علوم میں سے ہے جن سے کئی دوسرے علوم تشکیل پائے ہیں۔ بلکہ ریاضی تو کائناتی زبانوں میں سے ہے۔ یہ زبان آتی ہو تو کائنات کی ہیئت اور نشانیاں کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔

لیکن دوستو، آج کی یہ پریزنٹیشن ریاضی کی بے پناہ وسعت نہیں، بلکہ محدودیت کے بارے میں ہے۔ میں یہاں صرف گِنتی پر فوکس کروں گی اور سوال کو یوں پیش کروں گی: کیا ہر چیز جو گِنی جاسکتی ہے اسے گِنا جانا چاہیے؟

اس موضوع پر مفکرین نے کئی زاویوں سے بحث کی ہے۔ میں یہاں وضاحت کے لیے دو سنیریو[۲۱] سے مدد لوں گی۔

ٹرالی پرابلم – پہلا سنیریو

ہمارے دونوں سنیریو ایک مشہور خیالی تجربے[۲۲] سے اخذ کیے گئے ہیں جسے عموماً ٹرالی پرابلم[۲۳] کہا جاتا ہے۔ پہلے سنیریو کے لیے ذہن میں یہ منظر لائیں۔ ایک ریل کی پٹڑی ہے

---

[۲۱] Scenario

[۲۲] Thought Experiment

[۲۳] Trolley Problem

اور اس پر ایک بڑی سی ٹرالی چلی آ رہی ہے۔ آگے وہ پٹڑی دو لائنوں میں بٹ رہی ہے۔ ایک لائن پر پانچ افراد بندھے ہوئے ہیں اور دوسری پر ایک شخص بندھا ہوا ہے۔ اگر وہ ٹرالی سیدھی چلی جاتی ہے تو ان پانچوں افراد کو کچل دے گی۔ اور اگر اس کا رخ مڑ گیا تو ایک فرد کچلا جائے گا۔

جہاں وہ پٹڑی دو لائنوں میں بٹ رہی ہے، وہاں آپ موجود ہیں اور آپ کا ہاتھ اس دستے پر ہے جس سے آپ ٹرالی کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ کچھ نہیں کریں گے تو وہ پانچ افراد مارے جائیں گے۔اگر آپ دستے کو گھما دیں گے تو وہ ایک شخص جان سے جائے گا، لیکن دوسرے پانچ افراد بچ جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیاآپ اس دستے کو گھمائیں گے؟ (اَئل سامنے موجود شرکا کو سوچنے کا موقع دیتی ہے۔ پھر ان کی آرا سننے کے بعد کہنے لگتی ہے۔)

جی، عموماً دیکھا گیا ہے کہ اکثر لوگ دستہ گھمانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہاں بھی اکثر شرکا اسی کے حق میں ہیں کہ چھے میں سے پانچ افراد بچ جائیں، یہ بہتر صورت ہے۔ نوٹ کیجیے کہ یہاں اس مخمصے کا حل گِنتی کی منطِق سے کیا گیا ہے۔ یعنی گنتی کی بنیاد پر طے کیا گیا ہے کہ کون جیے گا اور کون مرے گا۔

یہاں یہ بھی نوٹ کیا جانا چاہیے کہ یہ محض ایک فرضی سنیریو نہیں ہے۔ عملی زندگی میں ایسے اخلاقی مخمصے سامنے آ سکتے ہیں۔ مثلاً جنگ کا زمانہ ہے اور امدادی کیمپ میں ہر طرف زخمی ہی زخمی پڑے ہوئے ہیں۔ صرف ایک ڈاکٹر ہے۔ اس کے سامنے ایک شخص شدید زخمی حالت میں لایا گیا ہے۔ زخمی کے بدن میں کئی گولیاں پیوست ہیں اور جان بچانے کے لیے آپریشن کرنا ضروری ہے۔ لیکن آپریشن کرنے میں جتنا وقت لگے گا اتنے وقت میں

طبّی امداد پہنچا کر پانچ دوسرے افراد کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ اب وہ ڈاکٹر کیا کرے؟ دیکھیں، یہاں بھی اخلاقی مخمصہ ہے نا!

ہمارے بعض شرکا نے یہ بھی کہا کہ وہ اس سنیریو میں کچھ نہیں کریں گے کیونکہ وہ کسی کی زندگی موت کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیں گے۔ اس بات میں وزن ہے۔ ایک نے یہ بھی کہا کہ جب ایسا کوئی معاملہ واقعی درپیش ہوگا اس وقت فیصلہ کریں گے، کیونکہ اُس کیفیت میں سوچنا اور ہوگا۔ جی اس بات پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔

ایک کومنٹ یہ بھی آیا کہ وہ اکیلا شخص کون ہے اور دوسری پٹڑی پر وہ پانچ افراد کون ہیں۔ میں اسی بات سے اپنے دوسرے سنیریو کی طرف آتی ہوں۔

ٹرالی پرابلم – دوسرا سنیریو

آپ سب شرکا، خاص طور پر جو پہلے سنیریو میں دستہ گھمانے کے حق میں تھے، فرض کریں وہ اکیلا فرد آپ کا قریبی عزیز ہے۔ یا کوئی مشہور علمی اور سماجی شخصیت ہے جس نے لوگوں کے لیے بڑا کام کیا ہے اور زندہ رہا تو مزید اچھے کام کرے گا۔ جبکہ دوسری پٹڑی پر عام افراد ہیں۔ اب آپ کیا کریں گے؟

(اَمَل سوچنے کا موقع دیتی ہے۔ حاضرین کی آرا سننے کے بعد کہنے لگتی ہے۔)

جی، اس بار دستہ گھمانے کے حق میں کم ہاتھ اٹھے۔ یہاں نوٹ کریں کہ جب ہم کسی فرد کو پہچانتے ہوں، اس کی قدر بھی جانتے ہوں، تو اسے فقط ایک نمبر کے طور پر نہیں برتیں گے۔ صرف گِن کر اس کی زندگی کے بارے میں فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں کریں گے۔

ہاں آپ میں سے ایک نے کہا کہ وہ اپنے عزیز کو 'قربان' کر دے گا تا کہ دوسرے پانچ افراد کی زندگی بچ جائے! لیکن فیصلہ یہاں بھی آسان نہیں تھا کیوں کہ آپ اس شخص کو

جانتے ہیں، وہ آپ کے لیے عزیز ہے، اسی لیے 'قربانی' دی جا رہی ہے! ویسے اسے 'قربان' کرنے سے پہلے اس سے بھی پوچھیں گے یا نہیں؟

لیکن دوستو، یہاں مقصود ٹرالی پرابلم کو حل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس گِنتی کی منطق کو عیاں کرنا تھا اور اس منطق کی بنیاد پر کیے جانے والے فیصلوں کو پرابلَمٹائز کرنا تھا۔ اور یہیں سے میں اپنے اصل سوال کی جانب پلٹتی ہوں۔ کیا ہر چیز جو گِنی جاسکتی ہے اسے گِنا جانا چاہیے؟ ہم کہاں گِنیں اور کہاں نہ گِنیں؟ اگر کسی انسان کو صرف نمبر کے طور پر دیکھا جائے، تو کہیں ہم اسے ادھورا تو نہیں دیکھ رہے ہیں؟ اسے ڈی ہیومنائز[۲۴] تو نہیں کر رہے ہیں؟ کیا گنتی کی منطق پر انسانوں کے درمیان فرق کیا جانا چاہیے؟ کیا گنتی کی بنیاد پر زندگی موت کا فیصلہ کیا جانا چاہیے؟ کیا اس منطق کی بنیاد پر دوسرے اہم اخلاقی و سماجی مسائل کو حل کیا جانا چاہیے؟

گِنتی کی حدود

دوستو، یہ سارے سوالات آسانی سے حل نہ بھی ہوسکیں، کم از کم تنقیدی طرز فکر کے نئے دریچوں کو کھولتے ہیں۔ مثلاً آپ دیکھیں ہمارے معاشرے میں نمبر اور گنتی کی منطق کس قدر سرایت کر گئی ہے۔ نمبر ہر جگہ حاوی ہوگئے ہیں۔ گنتی جیسے ترازو بن گئی ہے۔ انسانوں کو بھی صرف نمبر کے طور پر برتا جانے لگا ہے۔ جیسے کئی اسکولوں کے لیے بچّے محض نمبر ہوتے ہیں۔ وہ کلاس کا رول نمبر ہیں، امتحان کے مارکس ہیں، رجسٹر میں حاضری ہیں، مہینے کی فیس ہیں، سالانہ ڈونیشن ہیں۔ ہر بچّے کی قدر و قیمت ان نمبروں کے ترازو میں تولی جاتی ہے۔ کچھ یہی حال پورے معاشرے کا ہوگیا ہے۔ مثلاً ہسپتالوں کے لیے مریض فقط نمبر بن جاتے ہیں، فیکٹریوں کے لیے مزدور، دفتروں کے لیے ملازمین، میڈیا کے

---

[۲۴] Dehumanize

لیے ناظرین، کورپوریشنز کے لیے صارفین، حکومتوں کے لیے عوام، وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے نمبروں کے لیے حدود کا تعین نہیں کیا اور اب نمبروں نے ہمیں، ہمارے معاشروں کو جیسے کولونائز کر لیا ہے۔

ہم نے قدرتی ماحول کے ساتھ بھی کچھ یہی کام کیا ہے۔ زمین پانی، پہاڑ درخت، چرند پرند، ہر ایک کی قدر نمبر اور انسانی مفاد کے ترازو میں تولی جانے لگی ہے۔ مرغی کی قدر اتنی ہے جتنے وہ انڈے دیتی ہے۔ گائے کی قدر اتنی ہے جتنے لیٹر وہ دودھ دیتی ہے۔ درخت کی قدر اتنی ہے جتنے کلو وہ پھل دیتا ہے۔ زمین کی قدر اتنی ہے جتنے مَن اس پر اناج اُگتا ہے۔ جنگل کی قدر اتنی ہے جتنے ٹن لکڑی وہاں سے دستیاب ہوتی ہے۔ جیسے ان سب کی اور کوئی حیثیت، اور کوئی قدر و منزلت نہ ہو۔ ہمارے لیے یہ سب محض 'وسائل' بن گئے ہیں، قدرتی وسائل، نیچرل ریسورسس[۲۵]۔ ہم نے ہر ایک کو کموڈیٹی[۲۶] بنا دیا ہے، ہر ایک کی قیمت لگا دی ہے۔

آپ نے ریاضی میں وَرڈ پرابلم کیے ہوں گے جن میں سیب، امرود، روٹی، نان وغیرہ کی قیمت کا حساب لگانا ہوتا ہے۔ جمع، ضرب کرنا ہوتا ہے۔ کوسٹ اَنے لیسز[۲۷] کرنا ہوتا ہے۔ سپلائی ڈیمانڈ کو دیکھنا ہوتا ہے۔ بازار میں بھی اسی طرح قیمت طے ہوتی ہے۔ لوگ بھی پرائس ٹیگ دیکھ کر خریداری کرتے ہیں۔ اور شاید یہ بات ذہن میں بیٹھ گئی ہے کہ جو پیسے دیے جاتے ہیں وہی سیب، امرود، روٹی، نان کی اصل قیمت ہے۔ اور جس نے پیسے دیے ہیں اب وہ ان سب کا مالک بن گیا ہے اور جو چاہے کرے۔

---

[۲۵] Natural Resources

[۲۶] Commodity

[۲۷] Cost Analysis

آپ کیا کہیں گے؟

(حاضرین میں سے کچھ جواب آتے ہیں۔ آئل ان آرا کو سننے کے بعد کہنے لگتی ہے۔)

جی بالکل۔۔۔ آسکر وائلڈ نے بھی کسی موقع پر کہا تھا:

'Nowadays people know the price of everything and the value of nothing.'

ہمیں بھی بزرگوں نے نصیحت کی تھی کہ زمین آسمان، چاند سورج، ہوا پانی، سب حرکت میں آئے تو گندم کا خوشہ اگا۔ اس لیے جو کھاتے ہو اس کی قدر کرو! لیکن کیا یہ سب عوامل بھی ہمارے کوسٹ آنے لیسز میں شامل ہوتے ہیں؟ کیا نیچر کی بھی قیمت لگائی جا سکتی ہے؟ کیا قدرتی ماحول کی قدر کرنا بھی ہم ریاضی اور معاشیات میں سیکھتے ہیں؟

اگر گہرائی میں جا کر سوچیں تو ہم حتیٰ ایک روٹی کی قیمت بھی نہیں لگا سکتے۔ اور ہمارے مشینی ترازو ایک روٹی کا بھی قرار واقعی وزن نہیں بتا سکتے۔ ہم تو بس قدر کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جیسے قناعت کریں۔ شکر کریں۔ جن کی محنت مشقّت سے وہ گندم کا خوشہ زمین سے اگا، ان کی قدر کریں۔ جو روٹی کھائیں اس میں دوسروں کے حق کو نہ بھولیں۔ نیچر پر پرائس ٹیگ نہ لگائیں اور نہ اسے اپنی ملکیت سمجھیں۔

سو دوستو، میرا بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا ہر چیز جو گنی جاسکتی ہے اسے گِنا جانا چاہیے؟

اگر میں خلاصہ کروں تو پہلی بات یہ ہے کہ ہر چیز کو گِنا نہیں جا سکتا اور اس کی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ لوگ پھر بھی گمان کرتے ہیں کہ ہر چیز کو گِنا جا سکتا ہے اور قیمت لگائی جا سکتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو چیز گنی جاسکتی ہے، ضروری نہیں اسے گِنا ہی جائے یا گنتی کی بنیاد پر اسے تولا جائے۔ نمبروں اور گنتی کی حدود کا تعین بہت ضروری ہے، یعنی کہاں گِننا ہے اور کہاں نہیں۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہم قدروں کو

پہچاننا سیکھیں۔ ورنہ جس طرح آج انسانوں، دیگر جانداروں، اور قدرتی ماحول کا استحصال ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔

ریاضی پلس کیوں؟

دوستو، شاید یہ تنقیدی سوالات کچھ نئے کچھ عجیب محسوس ہوں۔ اور آپ کا ان سے متفق ہونا قطعاً لازم نہیں! لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ریاضی تو بڑا گہرا مضمون ہے۔ اس کے ذریعے تنقیدی طرز فکر اور سماجی شعور کی آبیاری ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسی بات کو سمجھنا کہ اگر ہم نمبروں کی حدود کو سنجیدگی سے لیں اور قدروں کو بھی پہچاننے لگیں، تو ہمارے معاشرے کیسے ریڈیکلی بدل جائیں گے!

قدروں کو پہچاننے لگیں تو سائنس، ادب، اخلاق، اور تاریخ میں فکر کے نئے دریچے بھی کھل جائیں گے۔ خود ہماری ریاضی کی سمجھ میں کتنی گہرائی آ جائے گی۔ مثلاً اس بات کو سوچیں کہ خود نمبر بھی کیفیت اور قدر رکھتے ہیں۔ 'صِفْر' کو انڈین فلسفے میں دیکھیں تو اسے محض 'خالی' اور 'بے وجود' نہیں سمجھا گیا بلکہ 'پوٹینشل' کے طور پر بھی دیکھا گیا۔ اور جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ انڈیا ہی سے صفر عرب اور مغربی سرزمینوں تک پہنچا۔ اسی طرح 'اِکائی' کو یونانی فلسفے میں دیکھیں۔ 'دوئی' کو ین-یانگ کے فلسفے میں دیکھیں۔ اور سارے نمبروں کو 'وحدت و کثرت' کے فلسفوں میں دیکھیں تو ذات، کائنات، سماج، اور فلسفہ تاریخ سے متعلق نئی بصیرتیں آشکار ہوتی ہیں۔ کچھ اور نہ کریں، بس پرکار لے کر روایتی ڈِزائن بنانے لگیں تو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ نمبر صرف کمیّت نہیں رکھتے، کیفیت اور قدر بھی رکھتے ہیں!

لیکن آپ جانتے ہیں ہمارے یہاں ریاضی کے نصاب میں اس طرح کی باتیں عموماً نہیں ملتی ہیں۔ ہاں زبان و ادب کی نصابی کتابوں میں کبھی کبھار کوئی فکر انگیز مضمون مل جائے تو الگ بات ہے۔ ورنہ خود ریاضی کو بس ایک محدود اسکوپ کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔

اسی بات کو دیکھتے ہوئے ہم نے اپنے اس کلب کا آغاز کیا ہے اور اس کا نام ریاضی پلس رکھا ہے۔ ہم یہاں ریاضی کو وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور انشاء اللہ آگے جا کر ہم ہی میں سے کچھ افراد ہوں گے جو حکمت و فلسفے اور تنقیدی طرز فکر کی بنیاد پر دنیا کے سامنے نئی تھیوریز اور پیراڈائمز پیش کریں گے!

ایک بار پھر، آپ سب کو ہمارے کلب میں خوش آمدید! ہم اس تعلیمی سال میں مختلف موضوعات پر پریزنٹیشن شامل کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ روایتی ڈِزائن کی ورکشاپس بھی منعقد کریں گے۔ آپ میں سے جو دوست اس میں دلچسپی رکھتے ہوں، اپنا نام ضرور لکھوا دیں۔

اگر کوئی سوال یا کومنٹ ہو تو ضرور شیئر کریں!

دل والی سائنس

(عملی سائنس)

(ایک نئے اسکول کی پرنسپل کا دفتر ہے جس میں ان دنوں اساتذہ کے لیے انٹرویو کیے جا رہے ہیں۔ اس وقت ایک امیدوار انٹرویو دے رہی ہیں جنھوں نے 'عملی سائنس' کے مضمون کے لیے اپلائی کیا ہے۔)

میڈم: آمنہ، آپ کے ذہن میں ہمارا اشتہار تو ہوگا۔ ہمیں اپنے ایلیمنٹری گروپ کے لیے عملی سائنس کی ٹیچر کی تلاش ہے۔ لیکن میں شروع سے وضاحت کر دوں کہ عملی سائنس کا جو رائج تصوّر ہے ہماری سوچ اس سے مختلف ہے۔ ہم نے اشتہار میں اس جانب اشارہ کیا تھا۔

آمنہ: جی میڈم، اسی اشتہار کو دیکھ کر میں نے یہاں اپلائی کیا ہے۔

میڈم: تو آپ سمجھ رہی ہیں کہ ہمارا عملی سائنس کا مضمون چار دیواری میں بند کسی کلاس روم یا لیب تک محدود نہیں ہے اور نہ یہاں ایک پیریڈ سے دوسرے پیریڈ کی دوڑ لگتی ہے۔ ہمارے اسکول کا وِژن نیچر اسکول کا ہے اور ہماری عملی سائنس بھی نیچر سے قریب ماحول میں سکھائی جاتی ہے۔ہم اسے ایک ہولسٹک سبجیکٹ کے طور پر لیتے ہیں اور اسی لیے یہ معاشرتی علوم، ریاضی، لینگویج، اور آرٹس وغیرہ سے جدا نہیں ہے۔

آمنہ: جی میڈم۔

میڈم (غور سے دیکھتے ہوئے): آمنہ، میں چاہوں گی کہ مزید وضاحت کروں۔ آپ نے بی ایس سی[۲۸] کیا ہے۔ اور ساتھ میں بی ایڈ[۲۹] بھی ہیں۔ اگر میں آپ سے کہوں کہ ہمارے عملی سائنس کے انوائرمنٹ میں اورگینک فارمنگ کی جاتی ہے تو کیا آپ دیسی کھاد کی تیاری سے لے کر بیج بونے اور فصل کاٹنے جیسے مرحلوں میں بچّوں کی رہنمائی کر سکیں گی؟

آمنہ: جی میڈم۔

میڈم (قدرے تامل کے بعد): اور ہمارے انوائرنمنٹ میں مرغیاں اور بکریاں بھی ہیں۔ وہاں فل ٹائم اسسٹنٹ ہیں، لیکن کوآرڈینیٹ کرنے کی ذمّہ داری اور بچّوں کی رہنمائی کا کام ٹیچر کا ہے، کیا آپ یہ کر سکیں گی؟

آمنہ: جی میڈم۔

میڈم: اور آمنہ، ہم نے اپنے اسکول میں ایک چھوٹا سا ایکو۔سسٹم بنانے کی کوشش کی ہے۔ بچّوں کو لنچ ہم خود فراہم کرتے ہیں، جس میں ہمارے اپنے کھیت سے اناج، پھل، اور سبزیاں وغیرہ استعمال ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں پانی ضائع نہیں ہوتا، بلکہ استعمال کے بعد کھیت میں چلا جاتا ہے۔ اورگینک 'ویسٹ'[۳۰] جانوروں کے کام آ جاتا ہے۔ باقی کو ہم کومپوسٹ کر دیتے ہیں اور وہ کھاد بن کر کھیت میں استعمال ہو جاتا ہے۔ ہم کاغذ کو خود ری سائیکل کرتے ہیں۔ اپنی انرجی کی ضروریات فی الحال سولر پینل اور بایو گیس سے پوری کر رہے ہیں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا ہم نے اپنے چھوٹے سے اسکول میں ماحولیاتی آگاہی اور

---

[۲۸] B.Sc. (Bachelor of Science)

[۲۹] B.Ed. (Bachelor of Education)

[۳۰] Organic 'Waste'

احساس ذمّہ داری کا کلچر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں بچّوں کی رہنمائی کر سکیں گی؟

آمنہ (مسکراتے ہوئے): جی میڈم، کیوں نہیں۔ میں نے یہی سب دیکھ کر تو آپ کے اسکول میں اَپلائی کیا ہے!

میڈم (اس بار جیسے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے): فرینکلی، مجھے حیرت ہے! اب تک کئی اُمّیدوار اس جاب کے لیے آئیں لیکن سب نے ابتدائی چند نکات ہی سن کر انکار کر دیا۔ ایک نے تو یہ بھی کہا کہ بی ایس سی کرنے کے بعد اب وہ کیا بکریوں کا دودھ دوہے گی اور یہی کام کرنا ہوتا تو اتنی پڑھائی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آمنہ، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں اس طرح کے ٹیچر اور اس طرح کی عملی سائنس کا تصوّر ناپید ہے؟

آمنہ: جی میڈم، عملی سائنس کے نام سے عموماً ایک محدود تصوّر ذہنوں میں ابھرتا ہے، جیسے چیزوں کو الٹنا پلٹنا، ان پر تجربے کرنا، ٹیبل اور ڈائیگرام بنانا، وغیرہ۔ اسکولوں میں بھی زیادہ تر اسی پر زور ہوتا ہے۔ آپ نصابی کتابوں کے سرورق دیکھیں تو بچّے مثلاً سفید لیب کوٹ پہنے ہوتے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگی شیشیاں ہوتی ہیں۔ کم ہوتا ہے کہ سرورق پر کوئی بچّہ گھاس پر لیٹا ہوا آسمان کی جانب دیکھ رہا ہو۔ دوستوں کے ساتھ نیچر میں ایکسپلوریشن کر رہا ہو۔ کھیت میں پھل اور سبزیاں چُن رہا ہو۔ اون سے دھاگا بُن رہا ہو۔ یا انار اور اخروٹ کے چھلکوں سے قدرتی رنگ بنا رہا ہو، وغیرہ۔ ان سب میں بھی تو سائنس ہے۔ سائنس تو بہت وسیع ہے۔

میڈم: بالکل! یہی بات! لیکن آج کل یہ سب لوگوں کو سمجھانا کتنا مشکل ہوگیا ہے۔ ہمارے بچّے اور خاص طور پر ہمارے شہر کے بچّے نیچر سے کس قدر دور ہوگئے ہیں۔ کس قدر

مصنوعی زندگی میں محصور ہو گئے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک چار دیواری میں قید ہوتے ہیں۔ اسی چار دیواری میں بیٹھے بیٹھے قدرتی ماحول سے متعلق کچھ کہانیاں اور نظمیں یاد کرا دی جاتی ہیں۔ کچھ ویلیوز پر بات کر لی جاتی ہیں۔ گملوں میں پانی ڈلوا دیا جاتا ہے۔ کاغذ کے لیے ری سائیکل بِن رکھ دیے جاتے ہیں۔ مہینے دو مہینے میں قدرتی ماحول کا ایک چکر لگا لیا جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو سال میں باری آتی ہے۔ اور بچّے بھی جیسے اس مصنوعیت کے عادی ہوگئے ہیں۔ اور نیچر میں بس پکنک منانے کے انداز میں جاتے ہیں۔ ٹورسٹ بن کر جاتے ہیں۔

لیکن آپ بتائیں، نیچر میں مہمان بن کر تھوڑی جایا جاتا ہے۔ نیچر تو ہمارا گھر ہے۔ اس سے تو اپنے گھر کی طرح کا رشتہ جوڑا جاتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے گھر میں سانس لیتا ہے۔ اس سے اُنس رکھتا ہے۔ اس سے جڑُا رہتا ہے۔ اپنے آپ کو اس گھر کے ایک فرد کے طور پر درک کرتا ہے۔ اس میں پروان چڑھتا ہے۔ کیا اس طرح نہیں ہے؟

آمنہ: جی میڈم، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم انسان جدیدیت[۳۱] کو اپناتے اپناتے نیچر سے اپنے گہرے رشتے کو بھول گئے ہیں۔ جیسے اب ہمیں نیچر کی خوبصورتی، اس کی تازگی، اس کی روشنی، اس کی دانائی کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسے ہم نیچر کا حصہ اور نیچر ہمارا حصہ نہیں ہے۔ اب نیچر ہم سے جدا ایک بے شعور سا وجود بن گئی ہے۔ لِونگ بِینگ[۳۲] سے لِونگ تھنگ[۳۳] بن گئی ہے۔ اور ہمارا نیچر سے تعلق اپنے کام اور فائدے کی حد تک رہ گیا ہے۔ ہم اپنی مصنوعی زندگی کو آسان بنانے کے لیے اس سے کام لیتے ہیں۔ وقتی فرار حاصل

---

[۳۱] Modernity

[۳۲] Living Being

[۳۳] Living Thing

کرنے کے لیے اس کے پاس جاتے ہیں۔ لیکن میڈم، گہرے رشتے یوں تو نہیں جوڑے جاتے۔ وہ تو دل سے جوڑے جاتے ہیں۔ عملی سائنس کا آغاز تو یہاں سے ہونا چاہیے۔ ہمیں تو اپنے بچّوں کو دل سے سائنس کرنا سکھانا چاہیے۔

میڈم: دل سے سائنس کرنا۔۔۔ بہت خوب!

آمنہ: جی میڈم، نیچر تو بڑی اعلیٰ اور مہربان ٹیچر ہے۔ خود کتاب بھی ہے اور خود اسے پڑھنا بھی سکھاتی ہے۔ ہمارا کام تو بچّوں کو اس سے رابطے میں لانا ہے۔ انھیں وہ اسپیس اور ایکسپوژر دینا ہے کہ وہ نیچر کو قریب سے دیکھیں۔ اسے محسوس کریں۔ اس سے باتیں کریں۔

میڈم: بہت خوب! کیا ہی اچھا ہو کہ عملی سائنس میں بچّے نیچر سے باتیں کریں! لیکن کیا یہ سکھایا جا سکتا ہے؟

آمنہ: جی میڈم، براہ راست سکھانا تو شاید ممکن نہیں۔ لیکن ہم کوشش کر سکتے ہیں کہ بچّوں کو ایک ہولسٹک ایکسپوژر ملے۔ ان کی تخیلی، تجربی، اور وجدانی حسّوں، سب کو نکھرنے کا موقع ملے۔ کم از کم عملی سائنس کے نام پر ان کی نگاہوں کو محدود نہ کر دیں۔ ان کے دلوں کو بے حس نہ بنا دیں۔ یعنی بچّے نیچر میں جائیں بھی لیکن اسے دیکھ نہ پائیں۔ یا نیچر سے باتیں کرنا ان کے لیے محض کہانیوں کی باتیں نہ بن جائے۔

میڈم، ہم اپنے یہاں کوشش کر سکتے ہیں کہ بچّے نیچر میں سیر حاصل وقت گزاریں۔ بامعنی سرگرمیوں میں حصّہ لیں۔ اپنے دلوں کو جوڑیں۔ پھر ممکن ہے وہ نیچر سے باتیں کرنا بھی سیکھ لیں۔ اور دیکھ پائیں کہ نیچر انھیں کون کونسے قصّے کہانیاں سناتی ہے۔ ان کے لیے کونسے اسرار کھولتی ہے۔ کونسی دانائی کی باتیں سکھاتی ہے۔

مثلاً کسی چراگاہ میں دور سے دیکھیں تو ایک بکری درخت سے پتّوں کو کھاتے ہوئے دکھائی دے گی۔ بظاہر وہ درخت کا نقصان کر رہی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں وہ بکری منہ لگاتی ہے، وہاں اور بھی جھاڑیاں پتّے اُگ آتے ہیں۔ درخت اور بھی سر سبز ہو جاتا ہے۔ یوں نیچر میں موجود ایکولوجیکل یونیٹی سمجھ میں آنی لگتی ہے۔ باہمی انحصاری[۳۴]، لائف سائیکل[۳۵]، اور میٹامورفَسِس[۳۶] جیسے کونسیپٹ بھی خود بخود سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ تحقیقی سوالات اور مفروضے ذہن میں بنتے ہیں۔ تخلیقی سوچ پروان چڑھتی ہے۔ خود سے دریافت کرنے کی صلاحیتوں میں نکھار آتا ہے۔ زندگی کے کئی رُموز بھی سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ اور تنقیدی سوالات بھی ذہن میں ابھرتے ہیں۔ مثلاً کہاں نیچر سے سیکھنا ہے کہاں نہیں۔ کہاں باہمی انحصاری ہے کہاں خود مختاری۔ کہاں لائف سائیکل ہے کہاں میٹامورفسں۔
علامہ اقبال نے بھی اس جیسی روش کی جانب اشارہ کیا ہے نا کہ ؏ گُل کی پتّی میں نظر آتا ہے رازِ ہست و بود!

میڈم: بہت خوب! بہت خوب! آمنہ، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بچّے فطری طور پر نیچر کی جانب مائل ہوتے ہیں، بلکہ نیچر سے باتیں بھی کر سکتے ہیں، لیکن ہمارا تعلیمی نظام ان کے فطری صلاحیتوں اور رجحانات کو کہیں دبا دیتا ہے۔ بزرگوں کی حکایات اور اقوال بھی بس یاد کرا دیے جاتے ہیں۔ جیسے یاد کرنا اور تجربہ کرنا ایک ہی چیز ہوں۔
ویسے آمنہ، میرا نہیں خیال کہ آپ نے یہ ساری باتیں ہمارے تعلیمی اداروں میں سیکھی ہیں---؟

---

[۳۴] Interdependency

[۳۵] Life Cycle

[۳۶] Metamorphosis

آمنہ: جی میڈم، کہیں کہیں اچھے اساتذہ بھی ملے جن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ لیکن بہت سی چیزیں بچپن میں سیکھنے کو ملی تھیں۔ میرا تعلق شمال کے ایک گاؤں سے ہے۔ نیچر سے قریب ماحول میں آنکھیں کھولیں، اسی میں ہم پلے بڑھے۔ ہماری صبح شام، سردی گرمی، خزاں بہار، زندگی کی روٹین نیچر سے جڑی ہوتی تھی۔ اسی لیے نیچر کی رِدھم[۳۷] بھی سمجھ میں آنے لگی۔ اور سمجھ میں آنے لگا کہ یہ سب بے وجہ تخلیق نہیں کیے گئے ہیں۔ گاؤں کی زندگی میں سائنس، سوشل اسٹڈیز، لینگویج، آرٹس، وغیرہ الگ الگ سبجیکٹ کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ ہمیں جیسے ایک ہولسٹک ایکسپوژر ملتا تھا۔ ہم وہیں کھیت میں اپنے ہاتھوں سے کام کرتے تھے، بڑوں سے حکایات و واقعات کو سنتے تھے، نسلوں کے تجربات سے سیکھتے تھے۔ البتہ کئی چیزیں بہتر انداز میں بھی ہو سکتی تھیں۔ لیکن پھر بھی نیچر کو دل سے سننا اور سمجھنا کچھ کچھ سیکھ لیا۔

مثلاً غور کریں تو کیسے ایک کونپل زمین سے پھوٹتی ہے اور سورج کی جانب بڑھنے لگتی ہے۔ سورج تک پہنچ نہیں پاتی لیکن اس سفر میں وہ کلی سے پھول بن کر فضا کو مہکا دیتی ہے! نیچر کی کتاب تو اس طرح کی نشانیوں، استعاروں، اور حکایتوں سے بھری پڑی ہے!

ہاں البتہ بچپن میں ان ساری باتوں کو اتنا شعوری طور پر نہیں سوچا تھا۔ سوچنے اور موازنے کا موقع بڑی جماعتوں میں جا کر ملا اور خاص طور پر جب شہر میں آ کر کالج میں داخلہ لیا۔ وہیں تنقیدی فکر بھی ابھری۔ کیونکہ کالج میں سائنس کی کلاس لیتے یا سائنس لیب میں ہوتے تو یوں لگتا تھا کہ ایک دوئی حائل ہوگئی تھی جس میں نیچر الگ اور ہم الگ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ ہم نے اپنی آنکھ اور کان کو بند کر لیا تھا اور اب نیچر سے براہ راست گفتگو کرنے کے بجائے بس ہاتھ لگا لگا کر اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بڑی حیرت

---

[۳۷] Rhythm

ہوتی تھی۔ مگر پھر یہ سوچ کر اس اپروچ کو بھی سیکھ لیا کہ یہ سائنس کے کئی میتھڈز میں سے ایک میتھڈ ہے۔

پھر میں نے بی۔ایڈ پروگرام میں داخلہ لیا۔ اس میں کچھ اچھی باتیں بھی سیکھنے کو ملیں لیکن پروگرام کی اورینٹیشن اسی کالج یونیورسٹی والی لیب سائنس کی تھی۔ شہری زندگی کی مصنوعیت بھی محسوس ہوتی تھی۔ مثلاً محض کاغذ پر درخت کی تصویر بنا کر، یا اس میں رنگ بھر کر، اور کلاس روم کے ڈسپلے بورڈ پر لگا کر تو نیچر سے رابطہ نہیں جوڑا جاتا!

لیکن میڈم، میں ان تعلیمی تجربات میں اچھی چیزیں تلاش کرتی رہی، خود سے کتابیں پڑھیں، نئی تحقیقات کو پڑھا۔ اور یوں ہولسٹک اسکول کے کونسیپٹ سے آگاہی ہوئی۔ اس دوران رشتہ داروں میں شادی ہوگئی اور ہم نے ارادہ کیا کہ شہر میں کچھ عرصہ رہنا ہے۔ میری خواہش تھی کہ ہولسٹک ایجوکیشن کے لیے کچھ کنٹری بیوٹ کروں۔ لیکن یہاں اس طرح کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آپ کے اسکول کا اشتہار دیکھا تو جیسے دعا قبول ہوگئی!

میڈم: ونڈر فل! میں خود ایک عرصہ ملک سے باہر رہی ہوں۔ اور فرینکلی پہلے اتنی گہرائی میں نہیں سوچتی تھی۔ زندگی یونہی مصنوعیت کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ہاں کہیں اندر ان باتوں کو محسوس ضرور کرتی تھی۔ مجھے ایک عرصے سے الرجی کے مسائل بھی پیش آنے لگے تھے۔ جہاں میں رہ رہی تھی وہاں ایک جگہ ایسے ہی پارٹ ٹائم جاب کے لیے اپلائی کیا۔ وہ ایک نیچر اسکول تھا۔ اس کی اپنی وسیع چراگاہ تھی جس میں بکریاں، مرغیاں اور دوسرے جانور آزادانہ گھومتے پھرتے تھے۔ اور وہاں پھل سبزیاں وغیرہ بھی اگائی جاتی تھیں۔ کیمیاوی کھاد، پیسٹاسائڈ وغیرہ بالکل استعمال نہیں کی جاتی تھیں۔ بہت ہی پیارا ماحول تھا۔ جیسے میں دھوپ بارش، گرمی سردی، خزاں بہار، ان سب کو پہلی بار قریب سے تجربہ کر رہی تھی۔

نیچر سے اپنے رشتے کو، خود اپنے آپ کو نئے انداز میں ڈسکور کر رہی تھی۔ میں روز خوشی خوشی گھر لوٹتی تھی۔ میرے الرجی کے مسئلے بھی کم ہوگئے تھے۔

وہاں بچّوں کو بھی دیکھتی تھی تو ان میں ایک فطری خوشی اور اطمینان نظر آتا تھا۔ نیچر سے لگاؤ نظر آتا تھا۔ اور ان کی شخصیت کے اندر ایک ٹھہراؤ بھی نظر آیا۔ ان بچّوں میں آگے جا کر ماحولیاتی آگاہی اور احساس ذمّہ داری بھی دیکھنے میں آئی۔

میں اس تجربے سے بہت متاثر ہوئی۔ بلکہ شوق اتنا بڑھا کہ نیچر اسکول میں تدریس کے بہت سے کورسس کر لیے۔ مثلاً نسل در نسل منتقل ہونے والے بیجوں کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے، مختلف موسموں میں کون کونسی جڑی بوٹیاں، پتّے وغیرہ کھلتے ہیں اور ان سے نیچرل دوائیاں کیسے بنائی جاتی ہیں، گرافٹنگ کیسے کی جاتی ہے، ایکولوجی کو سامنے رکھتے ہوئے کونسے موسم میں کونسے بیج بوئے جاتے ہیں، پانی اور اورگینک ویسٹ کو کیسے ری سائیکل کیا جاتا ہے، خام اون اور کپاس وغیرہ سے دھاگا کیسے بُنا جاتا ہے، مختلف رنگوں کو نیچرل سورسس سے کیسے حاصل کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ایک طرح سے یہ وہ چیزیں تھیں جو ہم اپنے بزرگوں سے سیکھنا بھول گئے۔ اور جیسے خود اپنے آپ کو بھی بھول گئے۔ ایک خواہش دل میں ابھری کہ ہمارے یہاں بھی ایسا اسکول بنایا جائے۔ یہی اپنا کونٹری بیوشن ہو جائے۔ بچّوں کو نیچر سے قریب تر وہ بچپن فراہم کیا جائے جو ان کا فطری حق ہے۔ آمنہ، کیا یہ ان کا فطری حق نہیں۔۔۔؟

آمنہ: جی میڈم، اسی طرح ہے۔

میڈم: آمنہ، ہماری اپنی کچھ آبائی زمین تھی جس پر یہ اسکول تعمیر ہوا ہے۔ ہم نے یہیں کے آبائی لوگوں کے ساتھ مل کر اسے ایک کوآپریٹو کے طرز پر بنایا ہے۔ ہم سب اسکول

کے بورڈ کا حصّہ ہیں اور ہمارے بچّے اسی اسکول میں جاتے ہیں۔ آپ نے آتے ہوئے بچّوں کو باہر کھیلتا ہوا دیکھا ہوگا۔ ان کے دن رات یہیں گزرتے ہیں۔

البتہ اب تک یہ سمجھ میں آیا ہے کہ اس طرح کا کام محدود زمین کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً علاقے علاقے میں موجود پبلک پارکس کو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ ایک سے زیادہ اسکول صبح کے وقت وہ جگہ شیئر کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ انتہائی اہم ہے کہ پروجیکٹ میں مقامی لوگ شامل ہوں اور مقامی مسائل بھی حل ہوں۔ کیونکہ ماحولیاتی تحفظ اور سماجی انصاف کے مسائل ایک دوسرے سے جدا تو نہیں۔ اصل بات ہمت اور ارادہ کرنے کی ہے۔ پھر کارواں بنتا جاتا ہے۔

لیکن آمنہ، باہر کچھ لوگ پھر بھی ہمت کر لیتے ہیں، لیکن یہاں کم لوگ ایسی جرات رکھتے ہیں۔ پہلی فکر یہ لگ جاتی ہے کہ کہیں ان کا بچّہ ڈاکٹر انجینئر بننے کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے!

آمنہ: جی میڈم، یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام خاص طور پر سائنس کی تعلیم تو جیسے اب بھی ۱۹۷۰ کے دور میں رہ رہی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کولونیل دور میں رہ رہی ہے۔ کیوں کہ اصل میں یہ اسی دور کی پیداوار ہے۔ اور اس دور کے گہرے نفسیاتی اور ثقافتی اثرات آج بھی ہمیں اپنے معاشرے میں نظر آتے ہیں۔ جب کہ خود سائنس کس قدر بدل رہی ہے۔ اب نیچر میں شعور ہونے پر ریسرچ کی جا رہی ہے۔ بزرگوں کے اقوال و حکایات میں ایکولوجی کے رموز تلاش کیے جا رہے ہیں۔ مائنڈ۔باڈی ریلشن کو از

سر نو سمجھا جا رہا ہے۔ ایگرو ایکولوجی[۳۸]، کلین انرجی[۳۹]، اور سسٹینبل سولوشنس[۴۰] پر کام ہو رہا ہے۔ خود موجودہ سائنس کی محدودیت اور ناکامیوں پر بھی تنقیدی فکر ابھر رہی ہے، خاص طور پر موجودہ ماحولیاتی اور دیگر بحرانوں کو دیکھتے ہوئے۔ جیسے ایک پیراڈائم شفٹ آ رہا ہے۔ ہمیں تو اپنے بچّوں کو اس طرح کا پیراڈائم شفٹ لانے کے لیے انسپائر کرنا ہے۔ ان میں تخلیقی اور تنقیدی فکر کو فروغ دینا ہے۔ لیکن ہماری نصابی کتابوں میں عموماً مخصوص تصوّرات حاوی نظر آتے ہیں جو ذہن کو کھولنے کے بجائے اسے تنگ نظر اور کولونائزڈ بنا دیتے ہیں۔ پورا کونسیپٹ، پورا وِژن بدلنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ایلیمنٹری سطح کے نصاب کو بدلنے کی بہت ضرورت ہے۔

میڈم: ونڈر فل! یہی کام ہم اپنے اسکول میں کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک ماڈل بنانا چاہ رہے۔ لیکن ایک بنیادی مسئلہ اچھے ٹیچرز کی دستیابی کا ہے۔ ایسے ٹیچرز جن کے لیے یہ کام بس ایک جاب نہ ہو۔ ان کی سوچ، ان کے رجحانات، اسی ہولسٹک نہج پر ہوں۔ اور جو اپنے اندر ہمت اور جرات رکھتے ہوں۔ نیچر اسکول سے متعلقہ مہارتیں بھی ساتھ ہوں تو کیا بات ہے۔ لیکن نہ بھی ہوں تو سیکھی جا سکتی ہیں۔ اور آپ جیسی ٹیچر مل سکیں تو وہ دوسروں کو انسپائر اور ٹرین بھی کر سکتی ہیں!

آمنہ، مجھے جب بھی موقع ملے گا میری خواہش ہے میں آپ کے گروپ کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکوں، کیا ایسا ممکن ہے؟

---

[۳۸] Agroecology

[۳۹] Clean Energy

[۴۰] Sustainable Solutions

آمنہ : میڈم، آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔ آپ سے اور اس اسکول سے مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔

میڈم: بس پھر آپ ہمیں فوراً جوئن کر لیں! آپ ابھی ہمارے اسکول کو دیکھنا چاہیں گی؟ اسی بہانے آپ کا مشورہ بھی مل جائے گا۔

آمنہ : جی میڈم، خوشی سے!

غیر جانبدار نقشہ

(جغرافیہ کا ایک سبق)

(ایک کانفرنس روم ہے جس میں ایک لمبی سی میز کے پیچھے ایک نجی تعلیمی بورڈ کے صدر اپنی مرکزی نشست پر بیٹھے ہیں۔ ان کے بائیں جانب ایک ریسرچ فرم کی لیڈ ریسرچر بیٹھی ہیں۔ صدر صاحب کی آواز کمرے میں گونج رہی ہے۔)

صدر صاحب: ڈاکٹر صاحبہ، یعنی آپ فرما رہی ہیں کہ چھ ہفتے لگانے کے باوجود آپ کی ٹیم ایک سادہ سے نقشے کا مسئلہ حل نہیں کر سکی؟ اور ہمیں تو ابھی معاشرتی علوم کے پورے نصاب کو غیر جانبدار بنانا ہے!

لیڈ ریسرچر (پرسکون لہجے میں): جی میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں لیکن آپ جس انداز میں معاشرتی علوم کو غیر جانبدار بنانا چاہ رہے ہیں، ہم پوری کوشش کرنے کے باوجود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ممکن نہیں۔

صدر صاحب (ایک ہاتھ سے سوالیہ انداز میں اشارہ کرتے ہوئے): ممکن نہیں؟ یہ کیا بات ہوئی؟ آپ تو معاملے کی اہمیت کو سمجھتی ہیں۔ جانتی ہیں کہ ملک میں معاشرتی علوم کا نصاب کس قدر متنازع بنا ہوا ہے۔ کوئی اسے آئیڈیولوجیکل کہتا ہے، کوئی کولونیل کہتا ہے، کوئی فاشسٹ، کوئی فکشن! اور پھر کیا کیا نعرے نہیں لگائے جا رہے ہیں۔ کوئی اسے لبرل بنانا چاہتا ہے، کوئی ہیومنسٹ، کوئی نیشنلسٹ، کوئی سوشلسٹ! یعنی افسوس کا مقام ہے کہ ہم حتیٰ نصاب کے معاملے میں بھی اس قدر اختلاف کا شکار ہیں۔ مجھے نہیں یاد پڑتا کہ ہمارے زمانے میں نصاب اس قدر پولیٹی سائزڈ ہوا کرتا تھا۔ ایک سیدھے سادے معاملے

کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ اسی لیے ہم نے اعلان کیا تھا کہ جلد ایک ایسا نصاب لائیں گے جو مکمل غیر جانبدار ہوگا، جو سب کے لیے قابل قبول ہوگا۔ اور میری تو سیکریٹری تعلیم سے اس سلسلے میں ملاقات بھی ہونے والی ہے۔ لیکن اب آپ مجھے بتا رہی ہیں کہ آپ کی ریسرچ فرم ایک سادہ سے نقشے پر اٹک گئی ہے!

لیڈ ریسرچر (اسی پرسکون لہجے میں): جی میں آپ کے کنسرن کو سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن بورڈ نے ہمیں جو ٹاسک دیا ہے، معذرت کے ساتھ پھر عرض کروں گی کہ ناقابل عمل ہے۔ اور آپ جسے سادہ سا نقشہ کہہ رہے ہیں وہ درحقیقت اتنا سادہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ---

صدر صاحب (بات کاٹتے ہوئے): کیسے ناقابل عمل ہے---؟

(صدر صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں اور اپنی دائیں جانب دیوار پر لگے نقشے کے پاس جاتے ہیں۔)

صدر صاحب: یہ--- یہ دنیا کا نقشہ جو یہاں لگا ہوا ہے، آپ کہہ رہی ہیں یہ غیر جانبدار نہیں؟ نیوٹرل نہیں؟ عجیب بات ہے! اس نقشے پر کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟

لیڈ ریسرچر: اگر اجازت دیں تو وضاحت کروں---؟

صدر صاحب: جی، فرمائیے!

لیڈ ریسرچر: جناب، ہم اپنی دنیا کو خلا سے دیکھیں تو یہ گول شکل کی دکھائی دیتی ہے۔ اور تھری ڈائمنشنل ہے۔ لیکن دیوار پر یہ نقشہ سپاٹ ہے۔ ٹو ڈائمنشنل ہے۔ آپ نے بچّوں کی پلاسٹک کی گیند دیکھی ہوگی جس میں ہوا بھری جاتی ہے۔ ذہن میں لائیں اگر ایسی کسی گیند سے پوری ہوا نکال دی جائے تو بھی وہ اس نقشے کی طرح سپاٹ نہیں بنتی، خاص طور پر کناروں سے۔ یہی مسئلہ نقشہ بنانے والوں کو بھی پیش آتا ہے۔ اسی لیے ان کے نقشے دنیا

کی ہو بہ ہو تصویر نہیں ہوتے، بلکہ پروجیکشن ہوتے ہیں، جیسے کسی پروجیکٹر سے اسکرین پر تصویر بنتی ہے۔ پھر جیسے اس پروجیکٹر کے زاویے بدلنے سے اسکرین پر موجود تصویر بھی اوپر نیچے ہوجاتی ہے، اسی طرح کسی نقشے کے بنانے میں بھی چیزیں اوپر نیچے ہو سکتی ہیں۔ مثلاً جسے ہم شمال کہتے ہیں اسے جنوب میں بھی دکھایا جا سکتا ہے، کیوں کہ دنیا گول ہے۔ سو دنیا کا نقشہ کیسا بنتا ہے اس میں بڑا عمل دخل اس بات کا بھی ہے کہ بنانے والے کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ کیا مفروضے ہیں، کیا مقاصد ہیں، کن آلات اور تیکنیک کو چنا گیا ہے۔ اسی لیے ہماری دنیا کے کئی نقشے پائے جاتے ہیں، اگرچہ سارے سائنٹیفک بنیادوں پر بنے ہوتے ہیں۔

صدر صاحب: دنیا کے کئی نقشے---؟ یہ پہلی بار سن رہا ہوں!

لیڈ ریسرچر: جی، کئی نقشے۔ جیسے دیوار پر جو نقشہ لگا ہوا ہے اسے مرکیٹر پروجیکشن[۴۱] کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ اس نقشے میں یورپ بلکہ پورا شمالی نصف کرہ[۴۲] اصل رقبے کے مقابلے میں خاصا بڑا دکھائی دیتا ہے جبکہ جنوب میں افریقہ اور لاطینی امریکہ خاصے چھوٹے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن اگر آپ گال-پیٹرز پروجیکشن[۴۳] کو دیکھیں تو شمالی اور جنوبی ممالک اپنے اصل رقبے کے تناسب سے قریب تر نظر آئیں گے۔ البتہ گال-پیٹرز پروجیکشن یا جسے پیٹرز میپ بھی کہا جاتا ہے وہ بھی ٹو-ڈائمنشنل ہے اور اس کی بھی کئی محدودیتیں ہیں۔ یہ میں آپ کے لیے ایک کاپی لائی ہوں۔

---

[۴۱] Mercator's Projection

[۴۲] Northern Hemisphere

[۴۳] Gall-Peters Projection

(لیڈ ریسرچر اپنے سامنے موجود فائل میں سے ایک تصویر نکال کر صدر صاحب کی جانب بڑھاتی ہیں۔)

(صدر صاحب کچھ لمحے اس تصویر کو دیکھتے ہیں۔ اس کا موازنہ پیچھے لگے نقشے سے کرتے ہیں۔ پھر اپنے ہاتھ میں موجود نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔)

صدر صاحب: یہ کچھ مختلف دکھائی دے رہا ہے۔ چلیں مان لیا کہ دنیا کے کئی نقشے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر سائنٹیفک بنیادوں پر بنے ہیں تو نیوٹرل ہی کہے جانے چاہییں یا نہیں۔۔۔؟

لیڈ ریسرچر: جی سائنٹیفک تو کہے جا سکتے ہیں لیکن نیوٹرل کہنا پھر بھی مشکل ہے۔

صدر صاحب (دونوں ہاتھ سوالیہ انداز میں اٹھاتے ہوئے): یہ کیا بات ہوئی؟ سائنٹیفک کہہ سکتے ہیں لیکن نیوٹرل نہیں۔۔۔؟

لیڈ ریسرچر: جی نیوٹرل نہ ہونے کا تعلق اس سے بھی ہے کہ نقشے کو کیسے بنایا جاتا ہے، مثلاً کیا مفروضات اور مقاصد ہیں، اور اس سے بھی کہ سامنے سے کیسے لیا جاتا ہے۔ میں وضاحت کرتی ہوں۔ جیسے جب مرض کی تشخیص کے لیے سی۔ٹی اسکین کیا جاتا ہے۔ وہ اسکین بھی ایک طرح سے پروجیکشن ہوتا ہے۔ کئی چیزیں نظر آتی ہیں لیکن کئی دوسری چیزیں چُھپ جاتی ہیں۔ اور سی۔ٹی اسکین بدن پر منفی اثرات بھی چھوڑ جاتا ہے۔ نقشے اس سے بھی زیادہ گہرا کام کر جاتے ہیں۔ وہ صرف جغرافیے کو دکھاتے نہیں ہیں بلکہ اس پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ نقشے تو جغرافیے کو از سر نو تشکیل دے سکتے ہیں۔ مثلاً نقشوں پر موجود سیدھی سادی لکیریں زمین اور لوگوں کو تقسیم کر سکتی ہیں، انھیں گھٹا اور بڑھا سکتی ہیں، انھیں یکسر مٹا سکتی ہیں۔ ان لکیروں پر قوموں کی شناخت، حقوق، اور تقدیر کے فیصلے ہو رہے ہوتے ہیں۔ اگر لکیریں غلط کھنچ جائیں تو بعض اوقات انھیں بدلنے میں کئی نسلیں

لگ جاتی ہیں۔ سو نقشے سائنٹیفک ہونے کے باوجود نیوٹرل نہیں ہوتے۔ بلکہ خاصے متنازع بن جاتے ہیں۔

(صدر صاحب ایک نظر دیوار پر موجود نقشے کو دیکھتے ہیں۔)

صدر صاحب: آپ تو سیاست کی بات کر رہی ہیں۔ یعنی نقشوں کو سیاسی مقاصد کے لیے کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر خود نقشہ سائنٹیفک بنیادوں پر بنا ہے تو وہ بس سائنٹیفک ہے اور سائنٹیفک ہے تو نیوٹرل بھی ہے۔

لیڈ ریسرچر: جی لیکن یہاں سیاسی پہلو کو سائنٹیفک پہلو سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے شاید وہ حکایت سنی ہو کہ سولھویں صدی عیسوی میں اٹلی سے ایک پادری چین کے فرماں روا کے دربار میں گئے اور نذرانے کے طور پر ان کے سامنے دنیا کے تازہ ترین نقشے پیش کیے۔ پادری شاید توقع کر رہے تھے کہ چین کے فرماں روا متاثر ہوں گے۔ ان کی پذیرائی کریں گے۔ لیکن فرماں روا تو سخت خفا ہوگئے۔ آپ جانتے ہیں کیوں۔۔۔؟

(صدر صاحب نفی کے انداز میں خفیف سا سر ہلاتے ہیں۔)

لیڈ ریسرچر: کیونکہ نقشے کے وسط میں یورپ کو دکھایا گیا تھا اور حاشیے میں چین کو۔ جب کہ چینی فرماں روا اپنی سرزمین کو دنیا کے مرکز کے طور پر دیکھتے تھے اور۔۔۔

صدر صاحب (بات کاٹتے ہوئے): لیکن کسی نہ کسی علاقے کو درمیان میں ہونا ہوگا۔۔۔؟

لیڈ ریسرچر: جی، لیکن ہمارے یہاں آج بھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ یورپ ہی کو درمیان میں دکھایا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا نقشہ ایسے ہی تو رائج نہیں ہوا۔ اس کے پیچھے ایک پوری کولونیل تاریخ ہے۔ بلکہ نقشے تو کولونیل اقتدار کو قائم کرنے کا بہت اہم آلہ تھے۔ نقشوں اور اعداد و

شمار کے ذریعے کولونیل راج نے جگہ جگہ زمینوں کو تقسیم کیا، لوگوں کو تقسیم کیا، انھیں گھٹایا بڑھایا، اور یوں اپنے اقتدار کو قائم اور مستحکم کیا۔

صدر صاحب: لیکن یہ سب ماضی کی باتیں ہیں، اب قومیں آزاد ہوگئی ہیں، اب اس نقشے کو اتنا متنازع بنانے کی کیا ضرورت ہے؟

لیڈ ریسرچر: جی مگر کولونیل دور کے اثرات تو باقی ہیں۔ کیوں کہ آج بھی نقشوں پر کھینچی گئی لکیریں لوگوں کو ایک دوسرے سے لڑا رہی ہیں۔ البتہ یہ کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ صرف اثرات نہیں خود کولونیل دور بھی باقی ہے، کہیں پرانے انداز میں اور کہیں نئے۔ کیوں کہ آج بھی چند ممالک باقی دنیا پر اپنا تسلط قائم کیے ہوئے ہیں۔ اور آج بھی لوگوں کو آزاد کرانے یا انھیں تہذیب یافتہ بنانے کے نعروں کے ساتھ ان پر جنگیں مسلط کی جاتی ہیں۔ اور دوسری جانب آج بھی ایسے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو کمتر اور غیر تہذیب یافتہ سمجھتے ہیں۔ اپنی ظاہری مفلسی اور پسماندگی کا قصوروار بس خود کو ٹھہراتے ہیں۔ بلکہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کولونیل دور کو اچھا کہنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کے تعلیمی نظام آج بھی کولونیل دور سے اخذ شدہ ہیں۔ اور یہ سامنے موجود نقشہ بھی اسی تعلیمی نظام کا حصہ ہے۔ ایسے تعلیمی نظام کے ہوتے ہوئے بھلا تنقیدی خودآگاہی اور خود اعتمادی کی کیسے توقع کی جاسکتی ہے۔

صدر صاحب: لیکن ایک نقشے کو ان ساری چیزوں کا قصور وار تو نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔۔۔؟

لیڈ ریسرچر: جناب، یہ نقشہ تو ایک مثال ہے ورنہ معاشرتی علوم کا نصاب اس طرح کے مسائل سے بھرا پڑا ہے۔ اور خود ہم نے بھی تو ان مسائل میں اضافہ کیا ہے۔ ہم خود بھی تو ایک دوسرے کو گھٹاتے اور مٹاتے ہیں۔ ہمارے تعصّبات، تنگ نظری، اور مفادات کی جھلک بھی تو جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

صدر صاحب: لیکن یہ سیاسی مسائل ہیں جنھیں کسی دوسرے پلیٹ فارم پر حل کیا جانا چاہیے۔ تعلیمی نصاب میں انھیں حل نہیں کیا جا سکتا۔ خوامخواہ کیوں مسئلہ بنایا جائے۔ نصاب کو بس غیر جانبدارانہ رہنے دیا جانا چاہیے۔

لیڈ ریسرچر: لیکن اس نقشے کو اسی طرح نصاب میں رہنے دینا بھی غیر جانبدارانہ عمل نہیں۔ یوں تو ہم تنقیدی شعور کو اجاگر کرنے کے بجائے لاتعلقی کی کیفیت اور غلامانہ ذہنیت کو قائم رکھیں گے۔ پھر تو کچھ نہیں بدلے گا۔

(صدر صاحب کچھ تھکے ہوئے انداز میں اپنی کرسی پر دوبارہ آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔)

صدر صاحب: نہیں--- یہ پیچیدہ ہو رہا ہے۔ پھر آپ کو پیٹرز میپ پر بھی اعتراض ہوگا کہ اس میں بھی یورپ کو درمیان میں دکھایا گیا ہے۔ یعنی یہ بھی نیوٹرل نہیں ہے۔ اور یہ میپ تو دیکھنے میں بھی عجیب لگے گا۔

لیڈ ریسرچر (قدرے مسکراتے ہوئے): جی البتہ---

صدر صاحب: اوہ، لیکن اب تو جدید ٹیکنولوجی کا دور ہے۔ اب تو انٹرنیٹ پر سب کچھ مل جاتا ہے۔ پوری دنیا کو دیکھا جا سکتا ہے---؟

لیڈ ریسرچر: جی، لیکن ہم نے انٹرنیٹ پر اب تک مرکیٹر پروجیکشن ہی کو زیادہ تر دیکھا ہے۔ شاید آگے جا کر کوئی بہتر حل نکل آئے۔ لیکن ضرورت تو ہمارے اپنے نصاب میں تبدیلی لانے کی ہے۔ ہمارے ٹیچرز کو اس جانب متوجہ کرنے کی ہے۔ بلکہ اس بات کو بھی زیر بحث لانے کی ضرورت ہے کہ کیا ابتدائی تعلیم میں دنیا کو متعارف کرانے کے لیے ان سپاٹ نقشوں کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ نصاب میں

موجود نقشے، ہماری تسبیح میں مشغول ماں زمین[44] کو محض ایک بے جان شے کے طور پر دکھاتے ہیں۔ اس بے جان شے پر ہم انسان اپنی مرضی سے لکیریں کھینچتے ہیں اور اسے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ اس آیتِ الٰہی کا استحصال اور ضیاع کرتے ہیں۔ اس کی تکذیب اور بے حرمتی کرتے ہیں۔

صدر صاحب (قدرے اکتائے ہوئے لہجے میں): نہیں یہ تو پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح تو یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

لیڈ ریسرچر: جناب، کیا ضروری ہے کہ ہم معاشرتی علوم کو اسی طرح ریوائز کریں جس طرح آپ چاہ رہے ہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ ہم معاشرتی علوم کو الگ انداز میں متعارف کرائیں---؟

صدر صاحب: یعنی---؟

لیڈ ریسرچر: یعنی ہم معاشرتی علوم کو پورا ری کونسیپ چولائز[45] کریں۔ اسے محض فیکٹس اور ویلیوز یاد کرانے والے سجیکٹ کے بجائے ایک تنقیدی فیلڈ آف انکوائری کے طور پر ری ڈزائن کریں۔ مثلاً ہم یہ دونوں نقشے دیوار پر لگا سکتے ہیں۔ بلکہ کئی نقشے۔ ایسے نقشے بھی جن میں دنیا کو علامتی انداز میں باشعور اور مقدس دکھایا جائے۔

صدر صاحب: لیکن ہم اتنے سارے نقشے کیسے لگا سکتے ہیں---؟

لیڈ ریسرچر: جی ہم ویسے بھی دنیا کے کئی نقشوں کو دیکھنے کے عادی ہیں۔ مثلاً دنیا کا ایک نقشہ خشکی اور تری کا ہوتا ہے۔ ایک مختلف برّ اعظموں کا ہوتا ہے۔ ایک مختلف ممالک کا

---

[44] Mother Earth

[45] Reconceptualize

ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے نئے نصاب میں جب طلَبہ متبادل نقشوں کو دیکھیں گے تو موازنہ کریں گے، سوالات پوچھیں گے۔ یوں وہ نقشے بنانے کے پراسس کے بارے میں جانیں گے۔ نقشوں نے ہمارے ماضی اور حال پر جو گہرے اثرات چھوڑے ہیں، ان کے بارے میں جانیں گے۔ پھر شاید یہ سوال بھی ابھرے کہ کیا کولونیل دور واقعی ختم ہوگیا ہے۔ اور کہیں ہم نے کولونیے لٹی[٤٦] کو اِنٹر نلائز[٤٧] تو نہیں کر لیا ہے۔ کہیں ان لکیروں نے ہمیں بھی متعصب تو نہیں بنا دیا ہے۔ کہیں ہم بھی ایک دوسرے کو گھٹا اور مٹا تو نہیں رہے ہیں۔ ممکن ہے یہ سوالات بھی خود سے ابھریں کہ ہمارے سچائی کے معیار کیا ہیں اور ہماری انسانیت سے ہمدردی کی ویلیوز کیا ہیں۔ پھر ممکن ہے ایک بہتر مستقبل کی تلاش بھی کی جائے۔

صدر صاحب: نہیں، نہیں، یہ سب مجھے اتنا کنفیوزنگ لگ رہا ہے، ہمارے بچّوں کے لیے تو خاصا مشکل ہوگا۔ ہم کلاس ون، ٹو میں اس قدر مشکل باتیں نہیں کرسکتے ہیں۔

لیڈ ریسرچر: جناب، کلاس ون، ٹو میں ہم کئی دلچسپ سرگرمیاں کرسکتے ہیں۔ مثلاً بچّوں سے کہا جائے کہ اپنے محلّے یا گاؤں کا نقشہ بنائیں۔ یا اسکول سے گھر واپس جانے کے راستے کا نقشہ بنائیں۔ اور صرف فاصلوں اور زاویوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان نقشوں میں اپنی یادوں، قدروں، اور احساسات وغیرہ کو بھی شامل کر دیں۔ مثلاً کوئی جگہ ممکن ہے رقبے کے حساب سے بہت چھوٹی سی ہو لیکن اپنی قدر و منزلت میں خاصی مقدس ہو اور وہ ہمارے بچّوں کے نقشوں پر خاصی بڑی یا جگمگاتی ہوئی دکھائی دے۔ اسی طرح دیگر علامتی عناصر شامل ہو سکتے ہیں۔ آگے جا کر تنقیدی مباحث کو بھی براہ راست متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے

---

[٤٦] Coloniality

[٤٧] Internalize

بچّے کلاس ون، ٹو میں کچھ مباحث کے لیے تیار ہوں۔ ہوسکتا ہے یہ مباحث بعد کی کلاسوں میں شامل کی جائیں۔

صدر صاحب: نہیں نہیں، یوں نصاب کو ری کونسیپ چولائز کرنے سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ اگر ہم ان دونوں نقشوں کو دکھائیں گے تو خود اعتراف کر رہے ہوں گے کہ نقشے نیوٹرل نہیں ہوتے۔ ان میں مفروضوں اور تعبیروں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اور یہ نقشے متنازع بھی ہو سکتے ہیں۔ جب کہ ہمیں تو پورے معاشرتی علوم کو سائنٹیفک طرز پر پیش کرنا تھا، جس میں کوئی شک، کوئی اعتراض نہ ہو، جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔

لیڈ ریسرچر: لیکن جناب، معاشرتی علوم نیوٹرل نہ ہونے کے باوجود سائنٹیفک ہو سکتا ہے۔ شرط آبجیکٹو[۴۸] ہونے کی ہے، نہ کہ نیوٹرل ہونے کی۔ اور آبجیکٹیوٹی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے مفروضوں اور تعبیروں کی جانب متوجہ ہوں۔ انسانی معاشرے اور ایکولوجی پر ممکنہ اثرات بھی دھیان میں رہیں۔ بلکہ۔۔۔

صدر صاحب: ویٹ آ مِنِٹ!

(صدر صاحب جو ناامیدی کے ساتھ جھکے ہوئے بیٹھے تھے اچانک سیدھے ہو جاتے ہیں۔)

صدر صاحب: مجھے ایک خیال آ رہا ہے۔ ابھی آپ نے کہا کہ معاشرتی علوم نیوٹرل نہ بھی ہو، سائنٹیفک پھر بھی کہلاسکتا ہے۔۔۔؟

لیڈ ریسرچر: جی، بالکل! اور سائنٹیفک آبجیکٹیوٹی کو مد نظر رکھتے ہوئے۔۔۔

صدر صاحب: نہیں نہیں، بس مسئلہ حل ہوگیا! ہمارے بچّے بھی کنفیوز نہیں ہوں گے اور ہمارا وعدہ بھی پورا ہوجائے گا۔ ہم دنیا کا یہی رائج نقشہ نصاب میں استعمال کریں گے۔

---

[۴۸] Objective

صرف یہی نقشہ۔ مرکیٹر والا۔ لیکن اسے نیوٹرل کہنے کے بجائے، سائنٹیفک کہیں گے۔ اور اسی طرز پر ہم اپنے پورے نصاب کو بھی متعارف کروائیں گے۔

لیڈ ریسرچر (کچھ الجھن کے ساتھ): لیکن۔۔۔ یہ تو وہی متنازع نقشہ ہے۔ اس پر وہی اعتراضات ہوں گے کہ یہ یوروسنٹرک ہے۔ آئیڈیولوجیکل ہے۔ پولیٹیکل ہے۔ کولونیل ہے۔

صدر صاحب: لیکن پھر بھی سائنٹیفک بنیادوں پر بنا ہوا ہے!

(صدر صاحب کے چہرے پر اب ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔)

صدر صاحب: دیکھیں ڈاکٹر صاحبہ، ایک عام آدمی اس قدر باریک بینی کے ساتھ نہیں سوچتا۔ وہ سادہ اور آسان جوابات چاہتا ہے۔ اس کے لیے سائنٹیفک کا مطلب نیوٹرل ہی ہے۔ یوں ہم بھی اپنے وعدے پر قائم رہیں گے۔ ویسے بھی ہمارے بچّوں کو انگریزی، سائنس، اور ریاضی جیسے مضامین پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ان مضامین کو پڑھنے سے ملک ترقی کرے گا، نہ کہ ان تنقیدی گتھیوں میں الجھ کر۔ بس طے ہوگیا، اب سے ہم اپنی پبلسٹی میں 'سائنٹیفک' کا لفظ استعمال کریں گے۔ اور پورے کریکولم کو 'سائنٹیفک' بنیادوں پر ریوائز کریں گے۔ باقی جو چند اعتراض کرنے والے پھر بھی اعتراض کریں گے تو وہ سائنس کی مخالفت مول لیں گے! کرنے دیں اعتراض، خود ہی بھگتیں گے!

لیڈ ریسرچر: لیکن جناب اس سے نصاب کے بنیادی مسائل تو حل نہیں ہوں گے۔۔۔؟

صدر صاحب: دیکھیں ڈاکٹر صاحبہ، ہم نے اپنی طرف سے کوشش کی، لیکن اب نصاب غیر جانبدار نہیں بن سکتا تو کیا کریں۔ بہرحال ہمیں اپنے کیے گئے وعدے کو بھی پورا کرنا ہے۔ آپ اور آپ کی ریسرچ فرم کی بھی خواہش ہوگی کہ مثبت تبدیلی لائی جائے۔ لیکن آپ

پالیسی اور پبلک ریلشنز کا کام ہم پر چھوڑ دیں۔ آپ سے یہ گزارش ہے کہ ایک پروپوزل بنا کر جلد از جلد ہمیں بھیج دیں جس میں سائنٹیفک بنیادوں پر معاشرتی علوم کو ریوائز کرنے کا قابل عمل پلان ہو۔ آپ تنقیدی نقطہ نظر سے جو بھی تبدیلیاں تجویز کرنا چاہیں کر سکتی ہیں۔ صرف دو شرائط ہیں۔ ہمارا نیا نصاب بچّوں کو کنفیوز نہ کرے اور ہمارے لیے پبلک ریلشنز کے مسائل کھڑے نہ کرے۔

لیڈ ریسرچر: لیکن جناب آپ کی ان شرائط کے ساتھ بامعنی تبدیلی لانا مشکل ہوگا۔

صدر صاحب: دیکھیں ڈاکٹر صاحبہ، آپ پی ایچ ڈی ہیں۔ یونیورسٹی کی دنیا ممکن ہے آئیڈیل ازم کو کسی حد تک افورڈ کر سکے، لیکن یونیورسٹی سے باہر کی دنیا ریئل ازم بلکہ پریگمیٹزم کی دنیا ہے۔ یہ گیو اینڈ ٹیک اور کومپرومائز کی دنیا ہے۔ یہاں طرح طرح کے پریشرز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم اپنے آئیڈیلز کو حقیقت پسندی کے سانچے میں ڈھال سکیں تو وہ کام کے ہیں، ورنہ صرف بحث مباحثے سے کچھ حاصل نہیں ہونا۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ تبدیلی تدریجی عمل سے آئے تو پائیدار ہوتی ہے۔ آپ کی ریسرچ فرم اس پروجیکٹ پر رہے گی تو وقت کے ساتھ کچھ مثبت تبدیلیاں لا سکے گی۔ آپ کی جگہ کوئی دوسری ریسرچ فرم آ گئی جو ان مسائل کے بارے میں حساس نہ ہو تو کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ کیا آپ نہیں چاہیں گی کہ آپ کی ریسرچ فرم اس پروجیکٹ پر رہے۔۔۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔۔۔؟

لیڈ ریسرچر (چند لحظوں کے بعد): جی میرا خیال ہے میں سمجھ رہی ہوں۔

صدر صاحب (مسکراتے ہوئے): گڈ، تو پھر آپ سے جلد دوبارہ ملاقات ہوگی؟ چھے ہفتے کافی رہیں گے؟

لیڈ ریسرچر (کچھ سوچتے ہوئے): جی۔۔۔ ہم پوری کوشش کریں گے۔

ترقی کی دوڑ

(ترقی پذیر رہنے کے فوائد)

(شمال کے کسی گاؤں میں شام کے وقت بزرگوں کی ایک بیٹھک لگی ہوئی ہے۔ قریبی شہر کی ایک این۔جی۔او کا نمائندہ آیا ہوا ہے اور بیٹھک کے شرکا کو اپنے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔)

'جی بالکل، ہمارا کام سوشل ڈویلپمنٹ کا ہے۔ ہم گاؤں گاؤں جاتے ہیں۔ وہاں مسائل تلاش کرتے ہیں۔ بچّوں، بڑوں کی معصومانہ تصویریں لیتے ہیں۔ جا کر ڈونرز کو دکھاتے ہیں۔ ڈونرز کے دل پسیج جاتے ہیں۔ اور ہم فنڈز ہاتھوں میں لیے واپس آتے ہیں۔ فنڈز میں سے اپنا ایڈمنسٹریٹو خرچہ نکال کر باقی سارا گاؤں کو دے دیتے ہیں۔ یہ وِن۔وِن سچوایشن ہے۔ آپ کو پیسہ ملتا ہے، ہمیں پیسہ ملتا ہے، اور ڈونرز کو اپنی مراعات یافتہ زندگی کا مقصد مل جاتا ہے!'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'جی میں شاید بات کو صحیح طرح سے سمجھا نہیں پایا۔ دیکھیں، ہم اس لیے مسائل تلاش کرتے ہیں اور معصومانہ تصویریں بناتے ہیں تا کہ ان کے ذریعے کہانی سنا سکیں، بلکہ کئی کہانیاں سنا سکیں، شروع سے آخر تک۔ مثلاً پروجیکٹ شروع ہونے سے پہلے تصویریں لی جاتی ہیں اور شروع ہونے کے بعد۔ پہلے والی تصویروں میں معصوم بچّے پھٹے پرانے کپڑوں میں دکھائی دیتے ہیں اور بعد والی تصویروں میں اسکول کے رنگ برنگے یونیفارم میں۔ پہلے والی تصویروں میں وہ گلی کوچوں میں بے کار پھر رہے ہوتے ہیں، بعد والی تصویروں میں کلاس

روم میں بیٹھے الف، ب پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اور ہم ویڈیو بھی بناتے ہیں جس میں کوئی معصوم سا بچّہ کسی معصوم سی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ پھر کوئی ماں نظر آتی ہے جو یہ کہتے ہوئے رو پڑتی ہے کہ 'اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے کہ جو ہمیں نہ مل سکا، وہ ہمارے بچّوں کو مل رہا ہے'۔

لیجیے جناب! ہوگیا آپ کا کام! ایسی کہانی ڈونر کے سیدھا دل پر جا کر لگتی ہے!'

(سامنے سے پھر کچھ کہا جاتا ہے۔)

'جی جی، آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ صرف رنگ برنگے یونیفارم پہنانے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ مسائل تو بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن آپ بھی تو میری بات پر غور کریں! میں یہاں بات کر رہا ہوں صرف ایک اچھی سی کہانی سنانے کی۔ ایک ایسی کہانی جس میں ڈونرز سے کہا جاتا ہے کہ آپ کے چند ڈالر، چند یورو، چند دینار کسی دوسرے کی پوری زندگی بدل سکتے ہیں۔ پھر جب پیسہ آنا شروع ہوجائے تو دوسرے مسائل بھی حل ہونے لگتے ہیں۔ اسکول کی عمارت بننے لگتی ہے، اساتذہ کی آسامیاں کُھلنے لگتی ہیں، کینٹین سے لے کر اسکول کی وین تک لوگوں کو روزگار ملنے لگتا ہے۔ یعنی ایک اچھی سی کہانی آپ کے گاؤں کی تقدیر بدل سکتی ہے! آپ بس ہمیں وہ کہانی سنانے دیں اور ہم آپ کو فنڈز لا کر دیں گے!'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'جی جی، میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں کہ فل ٹائم اسکول کا مروّجہ ماڈل معصوم بچّوں کو بند کمروں میں محصور کر دے گا۔ انھیں ان کے ماحول سے کاٹ دے گا۔ آپ کے سوشل ایکو سسٹم کو بھی متاثر کرے گا۔اور آپ لوگوں نے جو ہولسٹک نیچر اسکول کا ماڈل اپنایا ہے، میں اسے بھی سمجھ سکتا ہوں۔ صبح بچّے کھیتوں اور چراگاہ میں وقت گزارتے ہیں۔

زمین آسمان، چرند پرند، درخت سبزہ، پانی ہوا، سب سے رشتہ جوڑتے ہیں۔ بزرگوں کی حکایتوں، نسلوں کے تجربوں، اور نئی تحقیقات کو جانتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے کام کرتے ہیں۔ مختلف فنون کو سیکھتے ہیں۔ سائنس اور سوشل اسٹڈیز وغیرہ کو ایک ہولسٹک سبجیکٹ کے طور پر سمجھتے ہیں۔ خود سے تحقیقی سوالات اور مفروضوں کو تشکیل دیتے۔ ماحول کے ساتھ ساتھ خود بھی نُمو پاتے ہیں۔ اور دوپہر میں بڑے بچّے دو تین گھنٹوں کے لیے اسکول آتے ہیں اور مختلف زبانوں، فنون، اور ریاضی وغیرہ کی مہارتوں پر مزید کام کرتے ہیں۔ دیکھیں میں یہ سب سمجھ سکتا ہوں۔ بیشک یہ ایک دلچسپ تعلیمی تجربہ ہے۔ اور میرے علم میں یہ بھی ہے کہ آپ کے بیشتر اساتذہ اسی گاؤں سے ہیں اور شہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد خدمت کے جذبے کے تحت واپس آئے ہیں۔ ان کا جذبہ واقعی قابلِ تحسین ہے۔ لیکن کیا کریں، ڈونرز کو سمجھانا مشکل ہے۔ آپ کا ماڈل مین اسٹریم نہیں ہے۔ اس کے نتائج بھی دو اور دو چار کی طرح واضح نہیں ہیں۔ جب کہ ڈونرز کو واضح اور فوری نتائج دکھانے پڑتے ہیں۔ خاص طور پر اگر ہمیں لمبا ہاتھ مارنا ہے تو کم از کم فل ٹائم اسکول کو چلتا ہوا دکھانا پڑے گا۔'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'جی یہ 'لمبا ہاتھ مارنا' منفی معنی میں نہیں ہے۔ مراد بڑے اداروں سے فنڈز لینا ہے، جیسے انٹرنیشنل این۔جی۔اوز[۴۹] وغیرہ سے۔ لمبا ہاتھ مارنے میں آپ کا شیئر بھی زیادہ ہوتا ہے اور ہمارا بھی۔ لیکن جیسا میں نے عرض کیا، ان بڑے اداروں کو مطمئن کرنا آسان نہیں ہے۔ دو چیزیں تو انتہائی ضروری ہیں۔ معصومانہ تصویریں اور نمبر۔ تصویروں کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ نمبر ان بڑے اداروں کو بتاتے ہیں کہ کتنے بچّے ہیں، کتنی جماعتیں ہیں، کتنے اساتذہ ہیں،

---

[۴۹] NGOs

ہر روز کتنے گھنٹے اسکول لگتا ہے، ہفتے میں کتنی کلاسیں ہوتی ہیں، ہر مہینے کتنے فیصد حاضری ہوتی ہے، کتنے فیصد نصاب کوَر ہوا، امتحان میں کتنے فیصد پاس ہوئے، کتنا پیسہ صرف ہوا، کہاں کہاں صرف ہوا، وغیرہ وغیرہ۔ ان بڑے اداروں کے پاس اپنے ٹمپلیٹ بنے ہوتے ہیں اور ہمیں انہی ٹمپلیٹ کے ساتھ کام کرنا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کا ماڈل اُن کے ٹمپلیٹ میں فِٹ کرنا مشکل ہے۔'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'جی بزرگو، آپ کو اپنے ماڈل کو فِٹ کرنے کی پروا نہ ہو، لیکن باقی دنیا کے سامنے آپ کے بچّے 'آؤٹ۔آف۔اسکول' کہلاتے ہیں۔ اَن پڑھ شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کے گاؤں کی ناخواندگی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں نے جو تعلیمی ماڈل اپنایا ہے، وہ ہر ایک کو نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اور جتنا وقت اس کو سمجھنے میں لگے گا اتنے وقت میں ٹمپلیٹ والے دس اسکول کامیابی سے چل سکتے ہیں۔ اور پھر ان بڑے اداروں کو بھی اپنے ڈونرز کو جواب دینا ہوتا ہے۔ ان کے اپنے ایجنڈا بھی ہوتے ہیں۔ یہ ادارے اکثر وہیں ہاتھ ڈالتے ہیں جہاں نتائج فوری اور توقع کے مطابق مل سکیں۔ ہم بھی یہی دیکھ کر مسائل ڈھونڈتے ہیں اور اپنے پروجیکٹ ڈِزائن کرتے ہیں۔ یعنی ہم اُن کی گیم کو سمجھتے ہوئے اپنی اسٹریٹیجی تشکیل دیتے ہیں۔ آپ سے بھی یہی گزارش ہے کہ ان کی گیم کو سمجھیے اور ہمیں خدمت کا موقع دیجیے!'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'جی آپ کی بات بڑی حد تک درست ہے کہ ہم صرف مسائل پر فوکس کرتے ہیں اور جو مسائل نہیں بھی ہوتے انھیں بھی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ پورے سوشل ایکو۔

سسٹم کو نہیں دیکھتے ہیں۔ بس چند شعبوں میں مداخلت کرتے ہیں اور نقصان کر دیتے ہیں۔

آپ کی اس بات میں بھی وزن ہے کہ ڈویلپمنٹ کے بیانیوں میں آپ لوگوں کو 'مفلس' اور 'پسماندہ' دیکھا جاتا ہے۔ باہر والے تو آپ کو اس نظر سے دیکھتے ہیں، خود مقامی لوگ بھی اپنے آپ کو اس نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور ذہنی طور پر مغلوب اور شکست خوردہ بن جاتے ہیں۔

اور میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ لوگ ترقی کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ سوال کر رہے ہیں کہ اپروچ کیا ہے، بیانیہ کیا ہے، سمت کیا ہے۔ آپ لوگ 'مسائل'، 'پسماندگی'، اور 'ڈویلپمنٹ' جیسے الفاظ اور بیانیوں سے ہٹ کر دوسروں کا تعاون چاہتے ہیں۔

لیکن آپ بھی تو بات کو سمجھیں! اگر مسائل نہیں ہوں گے، پسماندگی نہیں ہوگی، تو باہر والے کیوں تعاون کریں گے؟ پیسہ کیسے آئے گا؟ اور پھر جب پیسہ آجائے گا تو لوگوں کی عزت نفس اور خود اعتمادی بھی بحال ہوجائے گی!

میرے بزرگو، اس وقت ہر طرف ترقی کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ لیکن فنڈز محدود اور مقابلہ سخت ہے۔ جیتنے کے لیے اچھی کہانیاں سنانی ہوں گی، نمبر دکھانے ہوں گے، اور دائمی ترقی پذیری کی حالت میں رہنا ہوگا۔ یعنی آپ کا گاؤں مستقل پسماندہ اور ترقی پذیر دکھائی دے، جب کہ ڈونرز کے تعاون سے چلنے والے پروجیکٹ اور اس سے وابستہ افراد ترقی کرتے دکھائی دیں۔ یوں مسلسل پیسہ آتا رہے گا۔ افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ، جگہ جگہ یہی گیم کھیلی جا رہی ہے۔ خود بڑے ادارے بھی اپنے ڈونرز کو دکھانے کے لیے یہ گیم کھیل رہے ہوتے ہیں۔ اور ہم بھی آپ کے لیے یہی گیم کھیلنے کی بات کر رہے ہیں۔'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'ارے بزرگو، ناراض نہ ہوں! آپ ترقی کی دوڑ میں دوڑنا نہیں چاہتے، تو کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس ایک اور پیکیج بھی ہے۔ یہ بھی آج کل بڑے زور و شور سے چل رہا ہے۔ اس میں یوں دوڑنا نہیں ہے۔ بس بیٹھنا ہے، کھانا پینا ہے، ناچنا گانا ہے، مہمانوں کو اینٹرٹین کرنا ہے۔ یعنی ہم آپ کی مقامی ثقافت، زبان، اور طرز زندگی کے تحفّظ اور فروغ کے لیے فنڈز جمع کریں گے۔ آپ کے یہاں ثقافتی شو ہوں گے، روایتی کھانوں کے فیسٹول ہوں گے، کھیل تفریح کے پروگرام ہوں گے۔ ڈونرز آئیں گے، حکومتی نمائندے آئیں گے، ٹورسٹ آئیں گے۔ ثقافتی ادارے بنیں گے۔ ہوٹل بنیں گے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پیسہ آئے گا۔ مقامی معیشت ترقی کرے گی۔ پورے علاقے کا فائدہ ہوگا!'

(سامنے سے کچھ کہا جاتا ہے۔)

'ارے نہیں، آپ لوگوں کو درباری مسخرہ بننے کا کون کہہ رہا ہے اور نہ آپ کی مہمان نوازی کی قیمت لگائی جا رہی ہے۔ اور نہ آپ کے گاؤں کو کوڑے کا ڈھیر بنانے کی بات ہو رہی ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ لوگ لچک دکھانے کو تیار ہوں تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ آپ لوگ بھی تو ہمیشہ شکوہ کرتے ہیں کہ آپ کو پیچھے رکھا گیا ہے، آپ کے وسائل لوٹے جارہے ہیں، سکیورٹی اور ماحولیاتی تحفّظ کے نام پر آپ کی زمینوں اور چراگاہوں پر قبضہ کیا جا رہا ہے۔ آخر کب تک یوں شکوے شکایتیں کرتے رہیں گے۔ اپنی تقدیر کو اپنے ہاتھوں میں لیں، ورنہ حالات خود سے تو نہیں بدلیں گے!'

(اس بار سامنے سے کچھ نہیں کہا گیا بلکہ ایک بزرگ پاس کھڑے بچّوں کو اشارہ کرتے ہیں۔ یہ بچّے کچھ لمحے قبل ہاتھوں میں میٹھے پکوان لیے بیٹھک میں داخل ہوئے تھے۔ بچّے وہ پکوان مہمان کو پیش کرتے ہیں۔)

'ارے۔۔۔ چچ، آپ لوگوں نے تکلّف کیا۔۔۔! ویسے میں آپ لوگوں کے کھانوں کا بڑا شوقین ہوں۔ یہ کونسی ڈش ہے؟ اوہ اچھا اس میں خوبانی ڈالی گئی ہے۔ کیا بات ہے! ویسے آپ لوگوں کے یہاں پھل اور خشک میوے وافر مقدار میں اُگتے ہیں۔ اور نایاب جڑی بوٹیاں بھی ہوتی ہیں۔ مگر میں نے سنا ہے کہ یہ سب اکثر یونہی پڑے پڑے ضائع ہو جاتے ہیں۔ جانور پرندے انھیں کھا جاتے ہیں۔ اور مقامی بازار میں بس چِھلکوں کے دام بِکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے بھی ہمارے پاس ایک پیکج ہے۔ اس میں بھی بہت پیسہ ہے۔ ہم ڈونرز سے انفراسٹرکچر کے لیے فنڈز مانگیں گے۔ کپیسٹی بلڈنگ[۵۰] کے لیے فنڈز مانگیں گے۔ یوں آپ کے پاس زود اثر کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کے لیے پیسہ آئے گا۔ پروسیسنگ ٹیکنولوجی کے لیے پیسہ آئے گا۔ پروفیشنل ٹریننگ کے لیے پیسہ آئے گا۔ آپ کی پیداوار دِن دُونی رات چوَگنی بڑھے گی، خصوصی برانڈنگ ہوگی، ملکی اور بین الاقوامی منڈیوں تک رسائی ہوگی۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا، آپ کے علاقے میں پیسہ برس رہا ہوگا!

'جی جی۔۔۔ میں لے رہا ہوں!'

'بہت ہی مزے کا ہے!'

'ویسے یہ ہماری این۔جی۔او کا بزنس کارڈ ہے۔ اس پر ہمارے سوشل میڈیا کے لِنک بھی درج ہیں۔ ہم نے اب تک جو کہانیاں تشکیل دی ہیں، سب وہاں دیکھیں جا سکتی ہیں۔ آپ ایک بار ضرور دیکھیے گا۔ آپ کے برابر والے گاؤں کی کہانیاں اور ویڈیوز بھی مل جائیں گی۔ وہ گاؤں تو ہماری سب سے بڑی سکسیس اسٹوری[۵۱] ہے۔ میں امید کر رہا ہوں کہ ہم آپ لوگوں کی بھی اسی طرح خدمت کر سکیں گے!'

---

[۵۰] Capacity Building

[۵۱] Success Story

'جی جی۔۔۔ میں نے لیا!'

'جی بالکل، وہ بھی چکھوں گا!'

نیا نصاب

(ادبِ اطفال)

(ایک تعلیمی بورڈ کی پریس کانفرنس جاری ہے۔)

صحافی ا: ڈائریکٹر صاحب، سننے میں آیا ہے کہ آپ نے اپنے نئے نصاب سے کچھ کہانیوں کو نکال دیا ہے، خاص طور پر 'سونے کا انڈا دینے والی مرغی' کی کہانی کو۔ یہ کہانی تو بچّوں، بڑوں، سب میں خاصی مقبول ہے؟

ڈائریکٹر: آپ کے سوال کا بہت شکریہ۔ اس پریس کانفرنس کو تمام کرنے سے پہلے میں خود بھی اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ آپ کی بات درست ہے۔ ہم نے 'سونے کا انڈا دینے والی مرغی' اور اس جیسی دیگر کہانیوں کو نصاب سے نکال دیا ہے اور ان کی جگہ ہم جدید اخلاقی قدروں پر مبنی کہانیوں اور نظموں کو متعارف کروا رہے ہیں۔

یہاں میں واضح کردوں کہ سونے کے انڈے والی کہانی مجھے بچپن میں بہت پسند تھی اور آج میں اس پر تنقید کر رہا ہوں تو براہ کرم وجہ سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔

آپ سب جانتے ہیں اس کہانی میں کیا سبق دیا جاتا ہے۔ کم پر راضی رہنے کو اچھا بتایا جاتا ہے۔ اور جب ایک شخص کوشش کرتا ہے کہ اپنے لیے زیادہ حاصل کرے تو اسے لالچی قرار دیا جاتا ہے اور اس کا انجام حسرت و ندامت دکھایا جاتا ہے۔

مگر ٹھہریں، میں اس کہانی کو ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہوں۔ ایک غریب کسان کو ایک مرغی ملتی ہے جو سونے کا انڈا دیتی ہے۔ پہلے دن جب وہ سونے کا انڈا دیتی ہے تو کسان بہت خوش ہوتا ہے۔ انڈے کو بیچ کر اپنے لیے کھانے اور دوسری ضرورت کی چیزیں لیتا

ہے۔ مرغی اگلے دن پھر سونے کا انڈا دیتی ہے۔ کسان اس انڈے سے اپنی دوسری ضروریات پوری کرتا ہے۔ اگلے دن ایک اور سونے کا انڈا ملتا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اب کسان کے ذہن میں آتا ہے کہ یہ مرغی عام مرغیوں کی طرح کیوں نہیں ہے، یہ سونے کا انڈا کیوں دیتی ہے، کیا اس کے پیٹ میں سونا بنانے کی کوئی مشین ہے، یا یہ سونے کے انڈوں سے بھری ہوئی ہے۔ چنانچہ وہ اس مرغی کو ذبح کر دیتا ہے، لیکن اندر سے کچھ نہیں نکلتا۔ جو ایک انڈا روزانہ مل رہا تھا، اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

یہاں ہم فوراً اس کسان کو موردِ الزام ٹھہرانے لگتے ہیں، کہ کم پر راضی رہنا چاہیے تھا، قناعت کرنی چاہیے تھی، لالچی آدمی تھا۔ جب کہ کیا ممکن نہیں اس نے یہ کام فطری تجسّس کے تحت کیا ہو۔ کیا ہم نے اسی طرح نیچر سے بہت سی چیزیں نہیں سیکھی ہیں۔ کیا ہم نے نیچر کو اسی طرح ایکسپلوئٹ کر کے بہت سے فوائد حاصل نہیں کیے ہیں۔ ورنہ بتائیں، ہماری زرعی و صنعتی ترقی کیسے ممکن ہوئی۔ آج کا انسان ترقی یافتہ کیسے بنا!

اور کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ اس کسان میں کہیں آنٹرپرینئرشپ[۵۲] کا جذبہ ہو۔ اس نے رِسک لیا تاکہ اپنے لیے کچھ بہتر حاصل کر سکے۔ ایک ساتھ بہت سے سونے کے انڈے مل جاتے تو اِنویسٹ کرتا، اپنے کام کو ترقی دیتا، ایک کامیاب انسان بنتا۔ آج ہم اسے لالچی کہہ رہے ہیں، اس کا مذاق اڑا رہے ہیں، لیکن سوچیں اگر اس نے مرغی کے اندر واقعی کچھ دریافت کر لیا ہوتا تو ہم ہی اسے کامیاب کہہ رہے ہوتے یا نہیں! روزانہ کئی اِسٹارٹ اَپ شروع ہو کر ختم ہو جاتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ رِسک لینے ہی کی مذمت کر دی جائے۔ اس طرح تو ہم خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ ہماری قدریں اسی طرح پسماندہ رہیں تو ہمارا ملک کیسے ترقی کر سکتا ہے۔

---

[۵۲] Entrepreneurship

صحافی ۲: سر، کم پر راضی رہنا پسماندہ قدر کیسے ہوگئی، یہ تو ہر دور کی قدر ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ اپنے اندر قناعت ہو تو دوسروں کو بھوکا نہ سونا پڑے۔ اور قناعت ہو تو دل بھی پرسکون رہتا ہے۔

ڈائریکٹر: دیکھیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا، جو مل جائے شکر کرنا، نہ ملے تو بھی شکر کرنا، شاید کچھ لوگ مجھ سے اختلاف کریں، لیکن یہ اُس دور کی اخلاقی قدریں ہیں جب جاگیردارانہ نظام تھا۔ عام آدمی کا کم پر راضی ہونا خواص کے حق میں تھا، کیوں کہ عام آدمی قناعت کرے گا تو خواص اپنے لیے جمع کرسکیں گے۔

لیکن آج کا دور آزادی اور آنٹرپرینئرشپ کا دور ہے۔ یہاں ہر کوئی میدان میں اتر سکتا ہے اور اپنے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش کر سکتا ہے۔ یہاں ایک فرد کی معاشی کامیابی پوری معیشت کی کامیابی ہے۔ اور یہ معیشت قناعت اور ایثار پر نہیں، مقابلے اور مفاد پر چلتی ہے۔ یہاں اینڈ لِس گروتھ[۵۳] کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس میں رُکا نہیں جاتا۔ اور کوئی رُکے گا تو پیچھے رہ جائے گا کیوں کہ دنیا آگے نکل جاتی ہے۔ ہمیں ترقی یافتہ بننا ہے تو ان جدید قدروں کو اپنانا ہوگا!

صحافی ۲: لیکن سر، پھر بچّوں کی اخلاقی تربیت کا کیا ہوگا؟

ڈائریکٹر: اخلاقی تربیت کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کونسے اخلاق کی تربیت۔ ہماری ذمّہ داری بچّوں کو حقیقی دنیا کے لیے تیار کرنا ہے، نہ کہ تخیّلاتی دنیا کے لیے۔ مثلاً بچپن سے ہم جو کہانیاں سنتے چلے آرہے ہیں ان میں بلّی، لومڑی، گیدڑ، اور دوسرے شکاری جانوروں کو عموماً مکّار اور خود غرض بتایا جاتا ہے اور منفی کردار کے طور پر

---

[۵۳] Endless Growth

پیش کیا جاتا ہے۔ جب کہ بھیڑ، بکری، اور مرغی وغیرہ کو بھولا بھالا اور معصوم بتایا جاتا ہے۔ لیکن یہ معصومیت آج کے دور میں کمزوری ہے۔ ہم اپنے نصاب میں جو کہانیاں لا رہے ہیں اُن میں بلّی، لومڑی، اور گیدڑ بھی ہیں اور بھیڑ، بکری، اور مرغی بھی، لیکن کوئی منفی کردار کا حامل نہیں ہے۔ ہر کوئی اپنی بقا اور مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے جنگل بیاباں میں موجود ہے اور۔۔۔

صحافی ۲ (بات کاٹتے ہوئے): لیکن سر، اس طرح تو ہم اپنے بچّوں کو جنگل کا قانون سکھا رہے ہیں؟ انسانی معاشرے جنگل کے قانون پر کیسے ترقی کر سکتے ہیں؟

ڈائریکٹر: جی جی، اس پر بھی بات کر لیتے ہیں۔ دیکھیں، جنگل کے قانون سے متعلق شاید کچھ غلط فہمی ہے۔ جنگل میں ایسا نہیں ہوتا کہ جانور ہر وقت ایک دوسرے کو چیر پھاڑ رہے ہوں۔ ایسا ہوتا تو جنگل کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔ جنگل میں جانور ایک متوازن ایکو سسٹم کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہر ایک کے لیے اپنا مفاد اور اپنی نسل کی بقا سب سے مقدّم ہوتی ہے۔ اور اسی لیے جانور کبھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، کبھی مدِ مقابل ہوتے ہیں، کبھی لاتعلق رہتے ہیں۔ یہ جنگل کی اخلاقی قدریں ہیں۔ باقی جو جانوروں میں ہمدردی اور ایثار کے پائے جانے کی باتیں کہی جاتی ہیں، اسے میں فینٹسی ہی کہوں گا۔

اور آپ غور کریں تو ہمارے انسانی معاشروں کا نظام بھی جنگل کے قانون سے کچھ مختلف نہیں۔ ہمارے معاشروں میں بھی اپنی اور اپنی نسل کی بقا سب سے مقدّم ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں بھی طاقت کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ مفاد، تعلقات، اور پیسے کی حکمرانی ہے۔ اور اصول، ضابطے، اور قوانین وغیرہ، جیسا کہ مشہور مقولہ ہے، مکڑی کے جالے کی طرح ہیں جس میں کمزور پھنس جاتے ہیں اور طاقتور اسے پھاڑ کر نکل جاتے ہیں۔ بتائیے، اس

حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ لیکن ہم پھر بھی بضد ہیں کہ اپنے بچّوں کو بھولا بھالا معصوم بنائیں!

صحافی ۳: جناب، یہی سونے کے انڈے والی کہانی، مرغی، بطخ، ہنس، وغیرہ کے کرداروں کے ساتھ مغربی ممالک میں بھی پڑھائی جاتی ہے جبکہ وہاں سرمایہ دارانہ نظام نافذ ہے اور وہ ترقی یافتہ بھی کہلاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھیں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس کہانی کو کچھ زیادہ ہی سیریسلی لے رہے ہیں؟

ڈائریکٹر: معذرت کے ساتھ، میں آپ کی بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔ ایسی مقبول کہانیوں کے لامحالہ مفید اور مضر اثرات ہوتے ہیں، کسی پر زیادہ کسی پر کم۔ آپ غور کریں تو بچّوں کے ابتدائی سال ان کی پوری زندگی کو بنا رہے ہوتے ہیں۔ ابتدائی سالوں میں بچّے ان کہانیوں سے صرف اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ نہیں کرتے، صرف بول چال نہیں سیکھتے، بلکہ معاشرتی رویے اور اخلاقی قدریں بھی سیکھتے ہیں۔ ان کی پوری شخصیت کی تشکیل ہو رہی ہوتی ہے۔ ماہرین تعلیم میری اس بات سے اتفاق کریں گے۔ بہت سے والدین بھی کوشش کرتے ہیں کہ صرف رنگین صفحات کو دیکھ کر اپنے بچّوں کے لیے کہانی کی کتابیں نہ چُنیں۔ چنانچہ اس میں شک نہیں کہ کہانیوں کے دور رس اثرات ہوتے ہیں۔

ہاں مغرب کے اقتصادی نظام کا وہاں کی اخلاقی قدروں سے کیا تعلق ہے، یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کا یہاں موقع نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو مغربی سوسیولوجسٹ ویبر[۵۴] اور اس کے ناقِدین کے کام کو دیکھ لیں۔ نطشے[۵۵] کے کام کو دیکھ لیں۔

---

[۵۴] Max Weber

[۵۵] Friedrich Nietzsche

صحافی ۴: سر، آج دنیا ایک کے بعد ایک بحران سے گزر رہی ہے۔ آپ جس اینڈ لِس گروتھ کی دوڑ کی بات کر رہے ہیں، مغرب نے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیا اور نتائج سب کے سامنے ہیں۔ کیا ضروری ہے ہم ان کی غلطیوں کو دہرائیں؟ بلکہ اب تو مغربی ممالک میں بھی ویلیو بیسڈ ایجوکیشن[۵۶] کی بات کی جا رہی ہے۔

ڈائریکٹر: دیکھیں، آپ کا سوال بھی اشارہ کر رہا ہے کہ قدریں اثر رکھتی ہیں، اسی لیے تو ویلیو بیسڈ ایجوکیشن کی بات کی جا رہی ہے! اور ہاں، پچھلے سوال کے ضمن میں یہ بھی عرض ہے کہ مغرب میں محض بھولی بھالی کہانیاں نہیں، بہت سی شرارتی اور تشدد آمیز کہانیاں بھی پڑھائی جا رہی ہوتی ہے۔ مثلاً گِرمس فیری ٹیلز[۵۷] کو دیکھ لیں۔ اب مغرب میں ان ساری کہانیوں کے کیا اثرات ہیں۔ وہاں کی فردی اور اجتماعی نفسیات سے کیا تعلق ہے۔ اور وہاں کی ثقافتی قدروں اور اقتصادی نظام سے کیا تعلق ہے۔ دوبارہ کہوں گا کہ یہ ایک تفصیلی بحث ہے جس کا یہاں موقع نہیں۔

لیکن جہاں تک مغربی ممالک میں بدلتے رویّوں کا تعلق ہے تو میں آپ کی توجہ کچھ تاریخی حقائق کی جانب دلاؤں گا۔ مغرب نے صدیوں قدرتی ماحول کا استحصال کیا۔ اور دوسری قومیں جو نیچر کے ساتھ کسی حد تک توازن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہتی تھیں، انھیں بھی جا کر کولونائز کیا، ان کے وسائل کو لوٹا، انھیں ہر طرح سے مفلس بنا دیا۔ وہ خود تو امیر ہوگئے اور دوسروں کو 'پسماندہ' اور 'ترقی پذیر' کہنے لگے۔ اور آج یہی مغربی ممالک انسانوں کے حقوق، جانوروں کے حقوق، اور ماحولیاتی تحفظ وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں۔ اور ہمیں بھی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ سراسر منافقت ہے۔ آج بھی مغربی ممالک غریب اقوام کے

---

[۵۶] Value Based Education

[۵۷] Grimm's Fairy Tales

وسائل لوٹ رہے ہیں۔ آج بھی ان کا کاربن فُٹ پرنٹ[۵۸] ہم سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اور ان کی حکومتیں آج بھی ماحولیاتی تحفظ کے معاملے میں پوری طرح سنجیدہ نہیں ہیں۔ بلکہ ماحولیاتی تحفظ کے نام پر ہمیں پھر سے پیچھے دھکیلا جا رہا ہے۔ ہاں، یہ ممکن ہے مغرب میں کچھ مخلص مفکّر اور مخلص تحریکیں بھی ہوں۔ لیکن وہ لوگ اس طرح کے نخرے افورڈ کرسکتے ہیں۔ ہم افورڈ نہیں کرسکتے۔ اور ہم سے توقع بھی نہیں کی جانی چاہیے!

صحافی ۴: لیکن سر، ماحولیاتی بحران تو سب کو متاثر کر رہا ہے۔ یہ صرف مغربی ممالک کا مسئلہ نہیں، یہ تو عالمی مسئلہ ہے۔

ڈائریکٹر: جی بالکل، یہ عالمی مسئلہ ہے۔ کیوں کہ اب ساری دنیا مغرب کے 'ترقی یافتہ' ہونے کی قیمت چکا رہی ہے۔ لیکن ہم ترقی پذیر ممالک کی مشکل یہ ہے کہ ہمیں ابھی مغرب کے نقش قدم پر چلنا ہوگا، جن قدروں کے ساتھ انھوں نے ترقی کی، انھیں اپنانا ہوگا، تا کہ ہم بھی ترقی یافتہ بن سکیں۔ہم بھی دولت مند بن جائیں تو شاید ہم بھی ماحولیاتی تحفظ کی باتیں کرنا افورڈ کر سکیں۔

البتہ یہ ممکن ہے مستقبل قریب میں عالمی منظر نامہ یکسر بدل جائے اور مثلاً ہم کسی بہت بڑے بحران میں مبتلا ہو جائیں جس کے بعد یہ جدید قدریں بھی فرسودہ ہو جائیں۔ لیکن فی الحال زمینی حقائق اسی بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنے نصاب پر باریک بینی کے ساتھ نظر ثانی کریں اور اپنے آپ کو ترقی یافتہ بننے کے لیے آمادہ کریں۔

اسی ضمن میں ہم نے شروع میں کوشش کی کہ سونے کے انڈے والی کہانی کو ریوائز کر کے نصاب میں رکھا جائے۔ ہماری کہانی میں یہ ہوتا کہ وہ کسان اپنے تجسّس کی بنا پر ایک دن اس خاص مرغی کو ذبح کر دیتا اور اندر سے سونے کا انڈا بنانے کا نسخہ دریافت کر لیتا۔

---

[۵۸] Carbon Footprint

پھر وہ دوسری مرغیوں کو اس نسخے کے ٹیکے لگا لگا کر سونے کا انڈا دینے والی بنا دیتا۔
کسان اپنے کام کو فیکٹری فارمنگ[۵۹] کی سطح پر لے جاتا۔ اسے روزانہ ڈھیر سارے سونے کے انڈے ملتے اور وہ بہت جلد ملک کا ایک کامیاب بزنس ٹائکون بن جاتا۔
ہم نے شروع میں بلبل اور جگنو والی نظم کو بھی ریوائز کیا۔ مشہور نظم ہے، آپ اور میں بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ ہماری نظم میں یہ ہوتا کہ بلبل پہلے جگنو کی روشنی سے فائدہ اٹھاتا اور اندھیرا چھا جانے کے باوجود اپنے آشیاں تک پہنچ جاتا۔ وہاں اسے بھوک لگتی اور وہ جگنو کو کھا جاتا۔ ظاہر ہے بلبل کے لیے یہ عمل بالکل فطری اور منطِقی ہوتا۔ اور وہ بھولا بھالا، دوسروں کے کام آنے والا جگنو بھی اپنے منطِقی انجام کو پہنچتا۔
مگر پھر بعض اعتراضات کے پیش نظر ہم نے اپنی نظر ثانی شدہ کہانی اور نظم دونوں کو مکمل ڈراپ کر دیا۔ لیکن ہماری دیگر کہانیاں اور نظمیں اس وقت چھپنے کے مرحلے میں ہیں اور جلد دستیاب ہوں گی۔

صحافی ا: ڈائریکٹر صاحب، آپ نے سونے کے انڈے والی کہانی کو اپنے نصاب سے نکال دیا ہے لیکن سننے میں آیا ہے کہ آپ کی بڑی کلاسوں میں 'اردو کی سَپلی' کے نام سے ایک کتاب پڑھی جا رہی ہے جس میں اس کہانی کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اس پر بحث بھی کی گئی ہے۔ اس بحث کو بغور پڑھا جائے تو آپ کی جدید اخلاقی قدروں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

ڈائریکٹر: جی میں اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ تحریر 'نیا نصاب' کے عنوان سے اُس کتاب میں موجود ہے۔ اگر میں مصنّف کی نیک نیتی سے آگاہ نہ ہوتا تو اس تحریر کو ہمیں پسماندہ رکھنے کی سازش قرار دے دیتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ موصوف کی یہ تحریر بلکہ پوری

---

[۵۹] Factory Farming

کتاب انتہائی غیر سنجیدہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ ہم نے اپنے بورڈ سے وابستہ تمام تعلیمی اداروں میں اس کتاب پر پابندی لگا دی ہے۔ اب ہمارے طلَبہ تو کیا، اساتذہ کو بھی اس کتاب کو اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی!

بس آخر میں یہی بات دہراؤں گا کہ بچّوں کی کہانیاں اور نظمیں وغیرہ بے ضرر نہیں ہوتی ہیں۔ صرف ذخیرہِ الفاظ فراہم نہیں کرتی ہیں، صرف بول چال نہیں سکھاتی ہیں، بلکہ پوری شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بچّے اور بڑے سب ان سے متاثر ہوتے ہیں، معاشرے تشکیل پاتے ہیں۔ اس لیے کہانیوں اور نظموں میں موجود الفاظ، کردار، واقعات، اقدار، ان سب کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جانا بہت ضروری ہے۔

اور ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ کہانیوں اور نظموں کے ذریعے ہم اپنے بچّوں کو کیا سکھانا چاہتے ہیں۔ کیا ہم ان تک پسماندہ قدروں کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ کیا بھولی بھالی کہانیوں اور نظموں کے ذریعے انھیں کمزور اور غیر حقیقت پسند بنانا چاہتے ہیں۔ یا ہم انھیں ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے اندر مقابلے اور مفاد کی قدروں کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ انھیں ایسا مضبوط اور کامیاب انسان بنانا چاہتے ہیں کہ دوسرے اُن سے مرعوب ہوں، نہ کہ انھیں کچل کر آگے بڑھ جائیں!

ہم نے کم از کم اپنے تعلیمی بورڈ میں کوشش کی ہے کہ بھولی بھالی اور فرسودہ قدروں کے خول سے باہر نکل آئیں۔ اور آپ سب سے بھی گزارش ہے کہ اس معاملے کی سنجیدگی اور گہرائی کو سمجھتے ہوئے ہمارے پیغام کو عوام اور عوامی نمائندوں تک پہنچائیں۔

آپ سب کا بہت شکریہ!

اُردوے مُعلّیٰ یا اُردوے شکست خوردہ؟[٦٠]

(مباحثہ)

(رات کے کسی پہر جنوبی ایشیا کے ایک 'پوسٹ کولونیل' ذہن میں کچھ سوچیں محوِ بحث ہیں۔)

پہلی آواز: آج دوبارہ وہی لطیفہ سننے کو ملا۔ ہمارا کوئی دیسی ولایت گیا تو بڑا متاثر ہوا کہ وہاں بچّے بچّے کو انگریزی آتی ہے! یار، ہمارے یہاں ایسے لطیفے کیوں مشہور ہیں؟

دوسری آواز: ہمارے یہاں ایسے لطیفے صرف انگریزی کے لیے نہیں عربی کے لیے بھی مشہور ہیں۔ ہم اِن زبانوں سے متاثر ہیں، یہ پتا چلتا ہے۔

پہلی آواز: یار، ہم اپنی زبان سے اتنے متاثر کیوں نہیں ہیں؟

دوسری آواز: اس لیے کہ ہم زندہ دل لوگ ہیں، اپنے آپ پر ہنسنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ اگر اپنی زبان سے متاثر ہوگئے تو ایسے لطیفے کہاں سننے کو ملیں گے!

پہلی آواز: نہیں، بات سنجیدہ ہے۔

دوسری آواز: بھئی انگریزی اور عربی بھی تو ہماری زبانیں ہیں۔ ابھی کثیر اللسان[٦١] ہونے کا دور ختم نہیں ہوا ہے۔ میں تو کہوں گا کہ ابتدائی عمر سے بچّوں کو کثیر اللسان ماحول ملنا چاہیے۔

---

[٦٠] مُعلّیٰ/معلاّ: عالی، بلند، بزرگ، بڑے درجے والا۔ اردوے مُعلّیٰ: فصیح و بلیغ اردو۔ یہاں مراد اعلیٰ تہذیبی، معنوی، اور تنقیدی طرزِ احساس کی حامل زبان سے ہے۔ اردو کے قدیم ناموں میں سے ایک نام اردوے مُعلّیٰ بھی ہے۔

[٦١] Multilingual

پہلی آواز: نہیں، مسئلہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ انگریزی کا ہماری زبان، ہماری سوچ، ہمارے ماحول، سب پر تسلط ہوتا جا رہا ہے، لیکن من حیث القوم ہمیں اس کا کوئی خاص افسوس بھی نہیں۔ کیوں کہ ہم ذہنی طور پر مغلوب ہیں۔ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ اور اب یہ حال ہے کہ نہ اردو ڈھنگ سے بول پاتے ہیں نہ انگریزی۔ پہلے نصاب سے فارسی زبان کو نکالا گیا تھا تو ہم نے کہا کہ ہمارے بچّے غالبؔ اور اقبالؔ کی فارسی شاعری کیسے پڑھ پائیں گے۔ اب تو ہمارے بچّے غالبؔ اور اقبالؔ کی اردو شاعری بھی نہیں پڑھ پاتے۔ حد تو یہ ہے کہ اب اردو لکھنے اور پڑھنے کے لیے رومن رسم الخط کا سہارا لیا جا رہا ہے!

(ایک تیسری آواز ابھرتی ہے۔)

تیسری آواز (پہلے آواز سے): یہ تم انگریزی کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ پہلے فارسی اور عربی نے بھی تو اردو زبان پر غلبہ کیا تھا۔ اور خود اردو نے بھی تو قومی نصاب اور میڈیا وغیرہ کے ذریعے علاقائی زبانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

پہلی آواز: نہیں، فارسی، عربی، اور دیگر زبانوں سے تو اردو زبان تشکیل پائی ہے۔ اور دیکھو، میں اردو کے معاملے میں بیرونی اثرات کے خلاف نہیں ہوں۔ زبانوں کے درمیان الفاظ اور مفاہیم کا تبادلہ تو انھیں اِنرچ[۶۲] کرتا ہے۔ لیکن بیرونی اثرات ہمیشہ مثبت نہیں ہوتے۔ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زبانوں کے درمیان تبادلہ کس نوعیت کا ہے، کس سیاق و سباق میں ہے، کیا مفاہیم داخل ہو رہے ہیں، کیا اثرات ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

تیسری آواز: تم شاید بھول رہے ہو کہ انگریزی نے بھی اردو کو خاصا اِنرچ کیا ہے۔ تم اردو سے انگریزی کو نکال دو گے تو ایسی اردو کو آج کل کون سمجھ سکے گا!

---

[۶۲] Enrich

پہلی آواز: انگریزی کے اسی تسلط کے حوالے سے تو بات شروع ہوئی تھی! اور اس بات سے انکار نہیں کہ اردو میں انگریزی کے بہت سے الفاظ، مفاہیم وغیرہ شامل ہوگئے ہیں اور سارے غیر موزوں بھی نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی بھی زبان اپنے طرزِ احساس[۶۳] کو ساتھ لاتی ہے اور اثرات ضروری نہیں ہمیشہ مثبت ہوں۔ لیکن کیا ہمیں اس کی کوئی پروا ہے؟ کیا ہمارے کوئی معیار ہیں؟ یا بس جو بات دل کو لگی اسے اپنا لیا؟

مثلاً انگریزی کے ہائی ہیلو کو دیکھو۔ کیا کوئی گہرائی، کوئی لطیف مفہوم ہے اس میں؟ جب کہ ہماری زبانوں میں تو سلام کے لیے کیسے موزوں الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اور کیا گہرے مفاہیم پائے جاتے ہیں۔ جیسے 'السلام علیکم'، یعنی تم پر سلامتی ہو! کیا شائستہ کلام ہے! کیا آفاقی شعور ہے! ایک دعا بھی ہے اور انسانی تعلقات اور معاشرہ سازی کی بنیاد بھی! یعنی یہ مختصر سا کلمہ اپنے اندر ایک جامع تہذیبی اور معنوی طرزِ احساس رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بتاؤ اس انگریزی ہائی ہیلو میں کیا رکھا ہے؟ یا یہ پوچھنا کہ تمہارا دن کیسا گزر رہا ہے، تمہارا وِیک اینڈ کیسا گزرا؟ بس یہیں تک پرواز ہے!

اور ہمارے ماحول میں تو یہ ہائی ہیلو ایک طبقاتی کلچر بن کر ماڈرنزم کا پرچار کر رہا ہوتا ہے۔ ایسا ماڈرنزم جو ہمیں اپنے آپ سے کاٹنے کے درپے ہے۔ ہماری زبان و تہذیب میں اچھی باتیں بھی تو ہیں، لیکن یہ ماڈرنزم تو نہلانے کے پانی کے ساتھ ساتھ بچّے کو بھی بہا دینے پر تُلا ہوا ہے!

دوسری آواز: ارے نہیں، حالات اتنے بُرے بھی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ہائی ہیلو کرنے والے بھی مشاعروں اور قوالی کی محفلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور انگریزی میں بھی تو گہرے

---

[۶۳] Sensibilities

مفہوم ملتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ 'گڈ بائی' اصل میں 'گاڈ بی وِتھ یو'[٦٤] سے نکلا ہے۔ یعنی مفہوم ہمارے 'خدا حافظ' جیسا ہے۔ ہاں لوگ گڈ بائی کو ہمیشہ اس مفہوم میں استعمال نہیں کرتے۔ لیکن نکتہ یہ ہے کہ انگریزی زبان میں بھی معنوی گہرائی پائی جاتی ہے۔

پہلی آواز: ہاں لیکن عام لوگوں کی آشنائی ان معنوی گہرائیوں سے کس حد تک ہوتی ہے؟ یہاں تو یہی ہائی ہیلو کا کلچر پھیل رہا ہے۔ ادب و ثقافت کے نام پر بھی عموماً ماڈرنزم کا پرچار ہو رہا ہے۔ اور پھر انگریزی زبان میں بہرحال وہ وسعت نہیں کہ ہمارے تہذیبی و معنوی طرز احساس کا احاطہ کر سکے۔ ابھی اسے وقت لگے گا۔ اردو کا اعلیٰ طرز احساس تو صدیوں کی محنت کا ثمر ہے۔ اس میں کلام خدا سے نورانیت آئی ہے۔ الہامی اثرات ہیں۔ تہذیبی حسن ہے۔ لیکن اب صورتحال یہ ہے کہ عوام کے درمیان اردو زبان و ادب تو کسی حد تک باقی ہے لیکن وہ طرز احساس بدلتا جا رہا ہے۔

دوسری آواز: اب میں سمجھا! تمہارا مسئلہ اتنا سادہ نہیں کہ خالص اردو بولی جائے۔ یا اردو زبان میں قومی پہچان کو ڈھونڈا جائے۔ تمہارا مسئلہ اس گہرے تہذیبی و معنوی طرز احساس کا ہے۔ اسی لیے تمہیں عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ سے اثرات لینے پر اتنا اعتراض نہیں جتنا انگریزی زبان سے ہے۔

پہلی آواز: ہاں اور انگریزی کے بھی خاص طور پر وہ اثرات جنھیں یہاں 'ماڈرنزم' سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور مراد شکوک اور وسوسوں کے اُن نِت نئے رجحانات سے بھی ہے جو بظاہر ماڈرنزم کی تنقید میں ابھرے لیکن طرز احساس میں ان کا سرا بھی ماڈرنزم کے سروں سے جا ملتا ہے۔ مثلاً ایک طرح سے ڈی کنسٹرکٹو تنقید[٦٥] ہمارے فلسفے اور حکمت کی روایات میں

---

[٦٤] God be with you!

[٦٥] Deconstructive Critique

بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن وہ تو باطنی حقیقتوں کے ادراک و عرفان کی طرف لے جاتی ہے۔ احساسات اور تجربات میں بالیدگی لاتی ہے۔ سماجی تجزیے میں بصیرت اور گہرائی کا سبب بنتی ہے۔ ادب میں سنجیدہ رجحانات کو فروغ دیتی ہے۔ خود مغرب کی معنوی روایات میں بھی اس طرح کی ڈی کنسٹرکٹو تنقید کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ لیکن جس طرح کے رجحان کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ تو اُن کے ظاہر اور باطن سب کو کھوکھلا کر رہا ہے۔

تیسری آواز: آپ سب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لوگ ہائی ہیلو کو اس لیے بھی ترجیح دیتے ہیں کہ سامنے والے پر اپنے عقائد کو نہ ٹھونسیں۔ اور جس اعلیٰ تہذیب و معنویت کے حامل بچّے کے یہاں گُن گائے جا رہے ہیں وہ توہمات و خرافات کی گود میں پلا ہے، نوابوں اور بادشاہوں کے درباروں میں پروان چڑھا ہے، اور گل و بلبل کی چوسنی اب تک اس کے منہ سے نہیں چھُٹی ہے۔ یہاں صدیوں کی گندگی جمع ہے، کہاں تک اپنے پیارے بچّے کو الگ کرو گے!

اور یہ بھی عرض ہے کہ اردو زبان کا کوئی ایک طرز احساس نہیں ہے۔ یہ زبان تو متنوع نفسیاتی، ثقافتی، اور تاریخی تجربات سے تشکیل پائی ہے۔ اسی طرح نہ انگریزی زبان کا کوئی ایک طرز احساس یا ایک کلچر ہے۔ اور یہ جو لفظ 'ماڈرنزم' استعمال کیا جا رہا ہے، اس کے بھی کوئی ایک معنی نہیں ہیں اور نہ اس کا سرا کسی ایک جگہ جا کر ملتا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ جسے یہاں 'مغرب' کہا جا رہا ہے اس کی جغرافیائی، سیاسی، لسانی، اور ثقافتی سرحدیں، تاریخ میں کئی بار بدلی ہیں اور یہ بھی اپنے اندر متنوع تجربات و افکار سموئے ہوئے ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر کچھ لوگوں کو مبالغہ آرائی کا شوق ہے تو بہت مبارک ہو کیوں کہ انھوں نے اپنے اس شوق میں یہاں مشرق اور مغرب کے درمیان ایک بے بنیاد جنگ کھڑی کر دی ہے!

پہلی آواز: میں نے کب کہا ہے کہ یہ مشرق اور مغرب کی جنگ ہے۔ میں جس طرز احساس پر تنقید کر رہا ہوں اس نے خود مغربی شعور کو کولونائز کیا ہوا ہے اور ہمیں بھی کولونائز کرنے آ گیا ہے۔ پھر مت بھولو کہ ہم پر بہرحال کولونائزیشن کی صورت میں جنگ مسلط کی گئی تھی جو آج بھی جاری ہے۔ اور اس جنگ میں ہمارا صرف جغرافیائی اور معاشی استحصال نہیں ہوا، بلکہ ہمیں علمی، ثقافتی، نفسیاتی، ہر لحاظ سے مفلس بنا دیا گیا۔ آج یہ حال ہے کہ ہم اپنی زبانوں سے کٹ گئے ہیں۔ حکمت و فلسفے کو بھلا بیٹھے ہیں۔ تہذیبی سفر میں بلندیوں پر پرواز کرنے کے بجائے زمین بوس ہوگئے ہیں۔ عالمی منظر نامے پر اپنا اثر چھوڑنے کے بجائے شکست خوردگی کا شکار ہوگئے ہیں۔ لیکن ہمیں ان باتوں کی پروا کیونکر ہو، ہم تو شوق سے سیلف-اورینٹلزم[٦٦] میں لگے ہوئے ہیں۔ جس طرح استعماری طاقتوں نے ہمیں کمتر سمجھا، ہمیں مفلس اور پسماندہ کہا، ہم بھی اپنے آپ کو کمتر کہتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے کو لطیفے بنا بنا کر سناتے ہیں!

تیسری آواز: سیلف۔اورینٹلزم--- ہا ہا ہا، یہ بھی خوب کہی!

(ایک چوتھی آواز بیچ میں کود پڑتی ہے۔)

چوتھی آواز: یار، تم لوگوں کو اس بحث میں اورینٹلزم گھسانا ضروری ہے؟ پچھلی بار بھی کم درگت بنی تھی جب ایڈورڈ سعید[٦٧] کو پڑھ رہے تھے۔ اور تم ساتھ میں برنارڈ کوہن[٦٨] کو بھی اٹھا لائے تھے! پورا پکا دیا تھا!

---

[٦٦] Self-Orientalism

[٦٧] Edward Said

[٦٨] Bernard Cohn

پہلی آواز: بھلا اورینٹلزم پر بات کیوں نہ کریں۔ ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا اور اب بھی جو ہو رہا ہے، کچھ کچھ سراغ ملتا ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہوں گا کہ ہمارے یہاں کولونیل ازم کا مسئلہ اب بھی نفسیاتی اور ثقافتی صورت میں باقی ہے۔ بلکہ بنیادی مشکل پہلے بھی یہاں تھی اور اب بھی یہاں ہے۔ ورنہ صرف جنگی طاقت کے بل بوتے پر چند ہزار لوگ ہم پر اتنے عرصے کیسے قابض رہ سکتے تھے۔ اور آج بھی قابض ہی ہیں گو کہنے کو ہم آزاد ہیں۔ یعنی آخر ایسا کیونکر ہوا کہ اگر آپ کو انگریزی فر فر بولنا آتی ہو، چاہے اردو کے دو جملے بھی نہیں بولے جاتے ہوں، آپ پڑھے لکھے تصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر انگریزی بولنا نہ آتی ہو، چاہے آپ کو اردو، سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، بلتی، شینا، بروشسکی، گجراتی، سرائیکی، غرض کہ اپنی دس زبانیں آتی ہوں، آپ پھر بھی جاہل تصور کیے جاتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ نہیں؟ آخر ہم یہاں تک کیسے پہنچے؟ کیوں اپنی زبان و تہذیب پر اعتماد کھو بیٹھے؟ کیوں انگریزی زبان کے یوں غلام بن گئے؟ ہاں انگریزوں کے بجائے ہمیں مثلاً فرانس نے کولونائز کیا ہوتا تو ہم اس ہائی ہیلو کی جگہ فخریہ 'بونژو، بونژو' کر رہے ہوتے!

تیسری آواز: پیارے، اب زبان پر پہرے بٹھانے سے کچھ حاصل نہیں ہونا۔ دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ انگریزی اب صرف مغربی زبان نہیں، عالمی زبان ہے۔ سائنس اور ٹیکنولوجی کی زبان ہے۔ جدید ادب، فنون، اور تنقید کی زبان ہے۔ اب صرف ترجمے پڑھ پڑھ کر قومیں ترقی نہیں کر سکتیں۔ تمہاری بحث ماضی سے وابستہ کسی نوسٹیلجا[۶۹] کو فیڈ کرنے کے کام تو آ سکتی ہے، اس کا کوئی عملی فائدہ نہیں ہے۔ ویسے بھی عملی طور پر ہم انگریزی کو اپنی سرکاری اور تعلیمی زبان کے طور پر قبول کر چکے ہیں۔

---

[۶۹] Nostalgia

پہلی آواز: یہی تو ہماری شکست خوردگی ہے! یہ بات فرانس اور جرمنی والوں کو کیوں سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ کیوں اپنے بچّوں کو اپنی قومی زبان پہلے سکھاتے ہیں۔ جاپان اور ایران والوں کو کیوں سمجھ میں نہیں آئی۔ ترکی اور روس والوں کو کیوں سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ سب کیوں انگریزی کو اپنی سرکاری زبان نہیں بنا لیتے۔ لیکن ہمارے ارباب اختیار نے تو طے کیا ہوا ہے کہ وہ حتیٰ معاشرتی علوم اور سائنس کے مضامین میں بھی بچّوں کو انگریزی سکھانے کی کوشش کریں گے۔ بلکہ ان کا بس چلے تو اردو کے مضمون کو بھی انگریزی زبان میں پڑھائیں!

اور ہمارے اُن والدین کو دیکھو جو اپنے بچّوں کو پہلے ان کی مادری زبان نہیں بلکہ انگریزی زبان سکھانے کی تگ و دَو میں لگے ہوتے ہیں، کہ انگریزی آ گئی تو جیسے نیّا پار لگ گئی! جیسے دنیا اور آخرت سنور گئی!

اور ہمارے اسکولوں کا حال بھی کوئی دیکھے۔ کم از کم اردو کا مضمون ہی احسن طریقے سے پڑھا دیا جاتا۔ لیکن یہاں تو کسی کو بھی اردو پڑھانے کے لیے بٹھا دیا جاتا ہے۔ اب اگر پڑھانے والا خود زبان کا ذوق و شوق نہ رکھتا ہو، اسے تدریس کا ہنر نہ آتا ہو، تنقیدی مباحث سے کوئی دلچسپی نہ ہو، تو کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بچّوں کی بول چال اور نگارش کی صلاحیتوں میں نکھار لائے گا، ادب کے ذوق و شوق کو پروان چڑھائے گا، یا تنقیدی اور تخلیقی طرزِ فکر کی آبیاری کرے گا!

لیکن ہمیں ان سب باتوں کی کیا پروا۔ ہمارا سارا ہمّ و غم تو اس پر موقوف ہے کہ ہمارے بچّے اسکول جائیں تو فر فر انگریزی بولنا سیکھ لیں۔ اردو کو تو ہم نے اُس کے اپنے گھر میں سوتیلا بنا دیا ہے!

دوسری آواز: یار انگریزی زبان کی ضرورت اور ملٹی لنگول ازم کی اہمیت تو ان ممالک میں بھی محسوس کی جا رہی ہے جن کا تم نے ابھی نام لیا ہے۔ اور اتنا پریشان مت ہو۔ اردو ہماری سرکاری زبان ہو یا نہ ہو، اس نے کہیں نہیں جانا۔ ہم لاکھ انگریز بننے کی کوشش کریں، اندر سے دیسی ہی رہیں گے اور اردو ہماری سگی زبان ہی رہے گی۔ البتہ یہ نہ بھولو کہ زبان منجمد حالت میں نہیں رہتی اور نہ اس کا طرز احساس۔ وقت کے ساتھ تبدیلیاں تو آئیں گی۔

پہلی آواز: ہاں نہ زبان منجمد حالت میں رہتی ہے اور نہ اس کا طرز احساس، لیکن ہماری بے گانگی اور شکست خوردگی اس کا کیا حال کر دے گی، کیا ہمیں اس کی کوئی پروا ہے؟ کیا ہمارے کوئی معیار ہیں؟ میں دوبارہ کہوں گا، ہمیں پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے لیے اعلیٰ تہذیبی، معنوی، اور تنقیدی معیارات کا تعین کرنا ہوگا، ورنہ بہاؤ کے ساتھ بہتے چلے جائیں گے۔ اب یہی دیکھ لو کہ ہمارے بعض علمی حلقے تو اردو کے رسم الخط کے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اب انھیں کیسے سمجھائیں کہ ان حروف میں سے ہر حرف کی اپنی قدر ہے جسے یوں رومن رسم الخط سے بدلا نہیں جا سکتا۔ مثلاً کوئی انھیں بتائے کہ الف کی کیا قدر ہے، اسے یوں لکھنے میں کیا گہرائی ہے، روایتی خطاطی کے اساتذہ ان قدروں کو کیسے برتتے ہیں اور اس میں۔۔۔

چوتھی آواز (بات کاٹتے ہوئے): یار، اب تم لوگ حسن عسکری، حسین نصر، اور رنے گنوں[۷۰] کو بھی لے آؤ گے۔ پھر اعلیٰ معیارات کی بحث کرتے کرتے تمہیں اقبالؒ کی معنوی تنقید بھی یاد آ جائے گی۔ یعنی پورا پکاؤ گے! بس چھوڑو اب! سونے کا وقت ہے!

---

[۷۰] Rene Guenon

(مزید آوازیں آنے لگتی ہیں۔)

مزید آوازیں: ہاں، ہاں، سو جانا چاہیے! کون اچھی سی لوری سنائے گا؟

دوسری آواز: ھم م م، کیا خیال ہے، ؏ خبرِ تحیّرِ عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی[71]؟

مزید آوازیں: ہاں، ہاں، یہ والی اچھی ہے! اچھے خواب آتے ہیں۔ یہی سناؤ!

دوسری آواز (پہلی آواز سے): تم اسی غزل کو دیکھ لو۔ دو تین صدیاں پرانی ہے لیکن آج بھی بھلائی نہیں گئی۔ بلکہ رومن رسم الخط میں اردو پڑھنے والی جوان نسل بھی اس سے واقف ہے، اگرچہ اشتہاری پروگراموں کے ذریعے ہی سہی! اور وہ بھی مغرب سے آئی ہوئی، مُضرِ صحت کولڈ ڈرنک کے اشتہاری پروگراموں کے ذریعے! سو پریشان مت ہو، اردو کا تہذیبی و معنوی ورثہ باقی بھی ہے اور مغربی تعاون اور کورپوریٹ اسپناسر شپ سے آئندہ نسلوں تک منتقل بھی ہو رہا ہے!

(دوسری آواز یہ کہہ کر جواب کا انتظار نہیں کرتی اور غزل گنگنانے لگتی ہے۔)

پہلی آواز: ہاں لیکن وہاں بھی وہ طرز احساس---

مزید آوازیں: ششش ش ش---!

پہلی آواز: میں کہہ رہا ہوں کہ---

مزید آوازیں: ششش ش ش، سو جاؤ!

---

[71] شاعر: سراج اورنگ آبادی

حصّہ سوم

ایک ہاتھ سے تالی

(تفہیم کا ہنر)

ایک نوجوان دانش جُو بڑی دُور کا سفر طے کر کے ایک بزرگ مَنک[۷۲] کے پاس پہنچا۔ دل میں خواہش تھی کوئی علم کا گوہر، کوئی دانائی کا راز حاصل ہو جائے۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اس جیسے نوجوان دانائی کی تلاش میں دیس دیس کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ لفظ دانشجو کا مطلب بھی کچھ ایسا ہی ہے، یعنی جو علم و دانائی کی جستجو میں ہو۔ اور جب اتنی تلاش کے بعد ایسے افراد کو دانائی کی کوئی بات، حکمت کا کوئی قول حاصل ہوتا تو وہ اس کی ہیرے موتی سے زیادہ قدر کرتے۔

یہ نوجوان دانشجو بھی اپنے کاندھوں پر کپڑے کا بستہ لٹکائے ایک عرصے سے محوِ سفر تھا۔ اُس کے بستے میں بس ایک قیمتی شے تھی اور وہ اوراق کا ایک دفتر تھا جس میں اس نے اب تک حاصل کیے گئے اقوال و حکایات کو جمع کیا تھا۔ یہی دفتر اس کی کُل کمائی تھی۔ باقی اپنی گزر بسر کے لیے وہ راستے میں کسی آبادی، کسی بازار کے قریب عارضی سکونت اختیار کر لیتا، محنت مزدوری کرتا، کچھ زاد راہ جمع کرتا، اور پھر سفر پر نکل پڑتا۔ اسی طرح کے عارضی قیام کے دوران اسے ایک تاجر ملا تھا جس نے اس بزرگ مَنک کے بارے میں بتایا تھا۔

---

[۷۲] Monk

بزرگ منک کی کُٹیا ایک پہاڑی کی چڑھائی پر جا کر آتی تھی۔ نوجوان دانشجو چڑھائی پر پہنچا تو وہ بزرگ باہر ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کی ہتھیلی پر ایک خزاں رسیدہ پتّا تھا جسے وہ بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کا دبلا پتلا سا بدن تھا اور وہ سادہ لباس میں تھے۔

اس بزرگ نے دانشجو کو آتا دیکھا تو مسکرا کر استقبال کیا اور اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ دانشجو نے اجازت لے کر اپنا مدّعا بیان کیا کہ وہ دانائی کی تلاش میں ہے اور انھیں اپنے دفتر کے بارے میں بھی بتایا۔

بزرگ منک نے دانشجو کی بات سن کر اپنا سر جھکا لیا۔ پہلے اپنی ہتھیلی پر موجود پتّے کو دیکھتے رہے، پھر ایک نظر اپنی دوسری ہتھیلی پر ڈالی جو خالی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ اُبھری، سر اٹھا کر نوجوان کی جانب دیکھا اور کہا:

'دو ہاتھ مل کر تالی بجاتے ہیں، ایک ہاتھ سے تالی کی گونج کیسی ہوتی ہے؟'

نوجوان دانشجو یہ سن کر شَش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک لمحے کے لیے خیال آیا یہ کیا عجیب سا سوال ہے۔ لیکن اس نوجوان کی تربیت میں اہلِ علم و دانش کا ادب کرنا شامل تھا، اس لیے وہ خاموشی سے اس سوال پر غور کرنے لگا۔ مزید سوچنے پر اسے اتنا اندازہ ہوگیا کہ سوال عجیب ضرور ہے لیکن بے معنی نہیں۔ اس میں کہیں گہرائی ضرور ہے۔ بزرگ منک دوبارہ اپنی ہتھیلی پر موجود پتّے کو دیکھنے میں محو ہوگئے تھے۔ نوجوان دیر تک سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے اجازت لی۔ بزرگ منک نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے نوجوان دانشجو اسی معمّا نما سوال کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا کہ کسی اہل دانش نے براہ راست جواب دینے کے بجائے اس کے سامنے کوئی سوال، کوئی معمّا رکھ دیا ہو۔ اس سے پہلے بھی ایک دوسری سرزمین

پر ایک بزرگ عارف ملے تھے جنھوں نے اس سے کہا تھا: **'دانائی فقط عبارت پڑھنے سے نہیں ملتی، دانائی تو دل میں پھوٹتی ہے، یہ بھی دیکھو دل کتنا زرخیز ہے'۔**

وہ نوجوان ایک عرصے تک اس بات پر سوچتا رہا۔ کیا دانائی عبارت میں نہیں ہوتی، کہ اگر عبارت کے معنی واضح ہوجائیں تو دانائی بھی حاصل ہوجاتی ہے؟ اور یہ دانائی پھوٹنا کیا ہوتا ہے؟ اور دل کی زرخیزی کیا ہوتی ہے؟ اُس بزرگ عارف کی بات کچھ مشکل لگی لیکن ساتھ ہی گہرائی بھی محسوس ہوئی۔ اس لیے نوجوان نے وہ قول اپنے دفتر میں لکھ کر محفوظ کر لیا کہ ابھی نہیں تو زندگی کے کسی اور موقع پر شاید سمجھ میں آجائے۔

پھر ایک اور سرزمین پر اسے ایک درویش ملے تھے۔ انھوں نے نوجوان کی عرضی سنی تو کہا تھا: **'دانائی تو جگہ جگہ بکھری پڑی ہے۔ حتیٰ ایک پھول کا کِھلنا بھی کافی ہے۔ لیکن آنکھ دیکھتی نہیں، کان سنتا نہیں، دل سمجھتا نہیں'۔**

نوجوان نے درویش کی نصیحت پر ایک عرصہ غور کیا۔ طرح طرح کے پھولوں کا مشاہدہ کیا۔ اندر باہر، پھولوں کے تمام حصّوں کو بغور جانچا۔ پھولوں کے نام اور اقسام کی فہرستیں بنائیں۔ پھر بھی وہ مطمئن نہیں تھا کہ یہی دانائی کا راز ہے۔ البتہ اس نے درویش کی نصیحت کو بھی لکھ کر محفوظ کر لیا۔

اور اب اس بزرگ منک نے بھی اسے کوئی سیدھا سیدھا جواب نہیں بتایا تھا۔ بلکہ اب جب کہ وہ غور کر رہا تھا، اسے تو بزرگ منک نے ایک کو۔آن [۷۳] دیا تھا۔

---

[۷۳] KOAN

کو۔آن ایک پہیلی کی طرح کا قول یا سوال ہوتا ہے جو بظاہر بے معنی اور متناقض ہوتا ہے۔ اس کا کوئی ایک جواب بھی نہیں ہوتا، بلکہ تہ در تہ معنی چھپے ہوتے ہیں۔ لوگ برسوں ایک کو۔آن پر غور کرتے رہتے ہیں اور نئے نئے معنی اخذ کرتے ہیں۔

نوجوان دانشجو کو پہلے بھی ایک کو۔آن ملا تھا۔ ایک دانا حکیم نے اس سے کہا تھا: **'سکوت گہرا ہوتا جائے گا تو سنائی بھی زیادہ دینے لگے گا'۔**

دانشجو ایک عرصے تک اس مخمصے میں الجھا رہا کہ سکوت طاری ہو تو آواز نہیں ہوگی اور آواز نہیں ہوگی تو سنائی کیسے دے سکتا ہے۔ اور جیسے ہی کوئی آواز پیدا ہوگی، سکوت فوراً ٹوٹ جائے گا۔ یہ تو دو اور دو چار کی طرح منطقی بات ہے۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس کو۔آن میں کہیں کوئی راز چھپا ہے، اس لیے اس نے وہ قول بھی لکھ کر محفوظ کر لیا۔

اور اب یہ کو۔آن اس کے سامنے تھا: **'دو ہاتھ مل کر تالی بجاتے ہیں، ایک ہاتھ سے تالی کی گونج کیسی ہوتی ہے؟'**

اس سوال میں کیا مطلب، کیا راز پوشیدہ تھا، آخر یہ کیسے کُھلے؟ نوجوان دانشجو یہی سوچتا ہوا پہاڑی سے اتر کر بازار تک آ گیا تھا۔ بازار سے گزر کر وہ سرائے آتا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ بازار میں نوجوان ایک قصائی کی دکان کے باہر سے گزرا۔ قصائی نے ایک اجنبی کو گزرتے دیکھا تو ہرزہ سرائی کے انداز میں فِقرہ کَسا۔ قصائی گھر سے لڑ کر آیا تھا۔ گھر میں اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بازار میں کسی سے مڈبھیڑ ہو اور وہ اپنی بھڑاس نکالے۔

قصائی تیار تھا کہ وہ نوجوان جواب میں کچھ کہے اور وہ اس سے بِھڑ جائے۔ لیکن نوجوان اپنی سوچوں میں مگن تھا اور اسی طرح چلتے چلتے دکان سے آگے چلا گیا۔ قصائی اس کے پیچھے اپنی دکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے پھر فقرہ کَسا، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ قصائی نے چربی کا ایک ٹکڑا نوجوان کی جانب اُچھالا۔ لیکن وہ ٹکڑا نوجوان کو لگنے سے پہلے ہی زمین پر گر گیا۔

نوجوان کو خبر ہی نہ ہوئی اور وہ اسی طرح چلتا رہا۔ قصائی نے نوجوان کو خَشم گیں نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ جھٹکا اور دکان میں واپس چلا گیا۔

سرائے میں وہ نوجوان رات کو لیٹا ہوا دیر تک سوچتا رہا کہ آخر ایک ہاتھ سے تالی کی گونج کیسی ہوتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ دانائی کا قول ہے، اگر اس وقت کوئی ایک مطلب سمجھ میں آ بھی جائے تب بھی ممکن ہے اس قول میں مزید گہرائی ہو جو زندگی کے کسی دوسرے موڑ پر پہنچ کر آشکار ہو، اس لیے بہتر ہوگا وہ اس قول کو اپنے دفتر میں نقل کر لے۔

نوجوان دوبارہ آ کر لیٹا تو سوچنے لگا کہ وہ جب بھی اپنے اقوال و حکایات کے دفتر کو کتابی شکل دے گا تو آج حاصل کیے گئے قول کو ایک کہانی کے انداز میں بیان کرے گا جس میں ایک نوجوان دانشجو طویل سفر طے کر کے ایک بزرگ منک سے ملتا ہے۔ اور وہ اس کہانی میں دوسرے معمّا نما اقوال بھی شامل کر دے گا۔ کیونکہ کہانی یاد رہ جاتی ہیں اور شاید اس طرح دانائی کے یہ اقوال بھی منتقل ہوجائیں۔ اور اگر وہ خود ان معمّوں کو کبھی حل نہ بھی کر پائے، یوں نقل کر دینے سے شاید آگے آنے والوں کا بھلا ہوجائے۔ اور علم و دانش کے باب میں یہی اس کی خدمت شمار ہوجائے۔

نوجوان دانشجو یہی سوچتے سوچتے نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

حکیم صاحب[۷۴]

(حفظانِ صحت کے اصول)

(ایک سرکاری دفتر میں دو ملازمین گفتگو کر رہے ہیں۔)

اقبال صاحب: جی شمیم صاحب، کہیے، اُن حکیم صاحب کے پاس ہو آئے؟

شمیم صاحب: جی، گیا تو تھا لیکن عجیب بات ہوئی۔

اقبال صاحب: کیوں، کیا ہوا؟

شمیم صاحب: ہمارے رشتہ دار نے تو بڑی تعریف کی تھی۔ میں مطب پہنچا تو دیکھا بس ایک سادہ سا کمرا ہے جس میں وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہیں۔ مجھے ساتھ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں کوئی شیشی، کوئی دوا، کوئی سفوف، کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ ان کے سامنے ایک تختہ سا تھا، جس پر لکھا جاتا ہے۔ وہ بولتے نہیں ہیں، لیکن سُن سکتے ہیں۔ ایک پرچی پر مجھے لکھا کہ اپنا مسئلہ بیان کریں۔ سو میں نے بتایا کہ ایک عرصہ ہوگیا ہے منہ سے ذائقہ اُٹھ گیا ہے۔ بس کھائے جاتا ہوں، لیکن نہ کھانے میں مزا آتا ہے اور نہ پوری طرح ہضم ہوتا ہے۔ اقبال صاحب، آپ تو میرا مسئلہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں کو دکھا چکا ہوں، کیا کیا دوائیں اور ٹوٹکے استعمال نہیں کیے ہیں!

اقبال صاحب: جی جی، بالکل۔ پھر حکیم صاحب نے کیا کہا؟

---

[۷۴] اس تحریر میں شامل تینوں کہانیاں مشہور حکایتیں ہیں جنھیں یہاں اپنے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

شمیم صاحب: بس پرچی پر لکھ لکھ کر مجھ سے سوالات پوچھتے رہے۔ میں نے بتایا کہ سرکاری ملازم ہوں، گھر ہے، گاڑی ہے، بیوی بچّے ہیں، اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ بس ایک عرصے سے یہ مسئلہ درپیش ہے۔

پھر حکیم صاحب نے میرا ہاتھ پکڑا اور نبض دیکھنے لگے۔ وہ کبھی سر جھکا لیتے تھے، کبھی میری آنکھوں میں دیکھنے لگتے تھے۔

اقبال صاحب: کوئی دوا تجویز کی؟

شمیم صاحب: یہی تو حیرت ہے۔ انھوں نے کوئی دوا، کوئی شربت، کچھ بھی نہیں دیا۔ بس ایک کے بعد ایک، پرچیوں پر دیر تک لکھتے رہے۔ کُل تین پرچیاں بنائیں۔ ہر پرچی کو پُڑیا کے انداز میں باندھا اور ساری مجھے دے دیں۔ اور پھر دونوں ہاتھ بلند کر کے یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہے ہو کہ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ اور کوئی فیس بھی نہیں لی!

ماجرا کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن میں وہ تینوں پرچیاں گھر لے آیا۔ جب کھول کر دیکھا تو عجیب و غریب بات دیکھی۔ پرانے حکیموں کی کچھ کہانیاں لکھی تھیں اور بس! اقبال صاحب، میں دوا لینے گیا تھا یا کہانیاں لینے!

اقبال صاحب: واقعی عجیب بات ہے!

شمیم صاحب: سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ان پرچیوں کا کیا کروں؟

اقبال صاحب: ہوں ں۔۔۔ شمیم صاحب، میرے خاندان میں بھی کئی حکیم گزرے ہیں۔ ان پرانی طرز کے حکیموں کے طریقے کچھ الگ ہوتے ہیں۔ ہمارے آج کل کے ایلو پیتھک ڈاکٹروں کی طرح نہیں ہوتے۔ پھر یہ لوگ بدن اور روح کی وحدت کی بات کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ روح ہے جو آنکھ سے دیکھتی ہے، کان سے سنتی ہے، زبان سے چکھتی ہے۔

روح ہے جو بدن کو رواں بھی رکھتی ہے اور اس سے اثر بھی لیتی ہے۔ کبھی وہ اسے روح کہتے ہیں، کبھی نفس، کبھی جان، کبھی کچھ اور۔ مجھے تو آج تک یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں۔۔۔ لیکن شمیم صاحب، وہ پرچیاں آپ کے پاس ہیں؟ ذرا دکھائیں گے!

شمیم صاحب: جی ضرور، یہ دیکھیں۔ شاید آپ ہی کچھ بتا سکیں؟

(اقبال صاحب نے ایک پرچی لے کر کھولی اور قدرے بلند آواز میں پڑھنے لگے۔)

اقبال صاحب: 'مشہور ہے کہ ایک رئیس عرصے سے بیمار تھا۔ کسی کو اُس کی بیماری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بالآخر ایک دانا حکیم کو بلایا گیا۔ حکیم نے تجویز کیا کہ ایک خاص کمرا بنوایا جائے۔ رئیس نے حکم دیا کہ دانا حکیم کی ہر بات مانی جائے اور وہ جیسا کہے ویسا ہی کیا جائے۔ جب کمرا بن چکا تو دانا حکیم نے رئیس کو اس کمرے میں داخل ہونے کا کہا۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا، حکیم نے پیچھے سے دروازہ بند کر دیا۔ رئیس نے دروازہ کھٹکھٹایا، لیکن دروازہ نہ کھلا۔ چند لمحوں میں رئیس کو محسوس ہوا کہ فرش کا درجہ حرارت بڑھنے لگا ہے۔ وہ دروازہ پیٹنے لگا لیکن دروازہ پھر بھی نہ کھلا۔ کچھ ہی دیر میں وہ پسینے میں شرابور ہوگیا۔ اور گرم فرش پر کھڑا رہنا مشکل ہوگیا۔ وہ کبھی ایک پاؤں پر اچھلتا، کبھی دوسرے پاؤں پر۔ وہ خاصی دیر اسی طرح اچھلتا رہا۔ بالآخر نڈھال ہو کر گر پڑا۔ آنکھ کھلی تو اپنے بستر پر تھا۔ لیکن اس کی بیماری سِرے سے غائب ہو چکی تھی۔'

اقبال صاحب (پرچی پڑھنے کے بعد): بڑی عجیب کہانی ہے۔ گرم فرش پر اچھلنے سے بیماری غائب ہوگئی!

شمیم صاحب: جی بالکل، میں بھی یہی حیران ہو رہا تھا!

اقبال صاحب: ذرا دوسری پرچی دکھائیے!

(اقبال صاحب نے دوسری پرچی کھولی اور پڑھنے لگے۔)

اقبال صاحب: 'مشہور ہے کہ قدیم بغداد میں بہلول کے نام سے ایک دانا شخص تھا جو لوگوں کے درمیان دیوانہ بن کر رہتا تھا۔ ایک دن بازار میں ایک شیخ نے بہت اصرار کیا کہ کچھ نصیحت کریں۔ بہلول نے شیخ سے پوچھا، کیا تجھے پتا ہے کھانا کیسے کھاتے ہیں؟ شیخ نے جواب دیا، میں کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتا ہوں۔ بسم اللہ پڑھ کر آغاز کرتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا ہوں۔ آہستہ آہستہ چباتا ہوں۔ کھاتے ہوئے دوسروں کو تکتا نہیں ہوں۔ جب کھا لیتا ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور کھانے کے بعد دوبارہ ہاتھ دھوتا ہوں۔ بہلول نے سنا تو سر ہلاتے ہوئے کہا، تجھے تو کھانا کھانا بھی نہیں آتا! بہلول جب وہاں سے جانے لگتا ہے تو شیخ روک کر التجا کرتا ہے۔ اس پر بہلول کہتا ہے: غذا کی پہلی شرط اس کا حلال ہونا ہے۔ باقی سارے آداب کا کیا فائدہ جب غذا ہی حلال نہ ہو۔ حرام غذا تو قلب کو آلودہ ہی کرے گی۔'

اقبال صاحب (پرچی پڑھنے کے بعد): جی بس یہی لکھا ہے---

شمیم صاحب: جی اب بتائیں اس کا کیا مطلب ہوا؟ الحمد اللہ ہم ایک مسلمان ملک میں ہیں، یہاں سب حلال ملتا ہے۔ اور کیا حلال کیا حرام، اب زبان پر کسی بھی چیز کا ذائقہ محسوس نہیں ہوتا!

اقبال صاحب: جی میں سمجھ رہا ہوں۔ ذرا تیسری پرچی بھی دکھائیے!

(اقبال صاحب نے تیسری پرچی کھولی اور پڑھنے لگے۔)

اقبال صاحب: 'مشہور ہے کہ قدیم یونان میں دیو جانس نام کے ایک شخص کو لوگ دانا بھی مانتے تھے اور سر پھرا کہہ کر مذاق بھی اڑاتے تھے۔ اس کا نہ گھر بار تھا اور نہ اسے کوئی پروا تھی۔ جہاں جگہ مل جاتی وہیں بیٹھ کر کھانا کھانے لگتا تھا۔ ایک بار اسی طرح بیٹھا دال کھا رہا تھا کہ حاکم کے ایک مُصاحب کا وہاں سے گزر ہوا۔ مُصاحب نے دیو جانس کو دیکھا تو

کہنے لگا: اگر تم حاکم کی خوشامد کرنا سیکھ لو تو تمہیں یہ دال نہ کھانا پڑے۔ دیو جانس نے جواب دیا: اگر تم دال کھانا سیکھ لو تو تمہیں حاکم کی خوشامد نہ کرنا پڑے۔'

اقبال صاحب (پرچی پڑھنے کے بعد): لیجیے، بس یہی لکھا ہے!

شمیم صاحب: جی، اب بتائیں، اس کا کیا کروں! مجھے تو دال بھی بہت پسند تھی۔ لیکن اب صرف ذہن میں تاثر رہ گیا ہے، زبان کو تو ذائقہ بھول ہی گیا ہے!

اقبال صاحب: جی میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ واقعی عجیب معمّا ہے--- اوہ--- ایک منٹ شمیم صاحب، مجھے ایک خیال آ رہا ہے! ذرا تینوں پرچیاں دکھائیے!

(اقبال صاحب تینوں پرچیوں میں موجود الفاظ کو گننے لگتے ہیں۔)

اقبال صاحب (کچھ دیر بعد): شمیم صاحب، میرا خیال ہے مجھے کچھ کچھ معاملہ سمجھ میں آ رہا ہے۔

شمیم صاحب: وہ کیا؟

اقبال صاحب: میں نے عرض کیا تھا نا ہمارے خاندان میں کئی حکیم گزرے ہیں۔ یہ لوگ کئی علوم کے ماہر ہوتے ہیں۔ علم الاعداد وغیرہ سے بھی واقف ہوتے ہیں اور طب میں بھی اس علم کا استعمال کرتے ہیں۔ مجھے علم الاعداد تو نہیں آتا لیکن میں نے ان پرچیوں میں موجود تمام الفاظ کو گِنا، جو جواب آیا اس کے اعداد کو آپس میں جمع کیا، اور پھر تین سے تقسیم کیا، کیونکہ تین پرچیاں ہیں۔ شمیم صاحب، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ ---

اقبال صاحب: جی جی، کہیے؟

شمیم صاحب: اقبال صاحب، ہوسکتا ہے میں غلط ہوں، لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ یہ تینوں پرچیاں مل کر ایک تعویذ بنتی ہیں!

شمیم صاحب: تعویذ؟

اقبال صاحب: جی، تعویذ میں علم الاعداد کا استعمال ہوتا ہے اور یہاں بھی اعداد بے معنی نہیں ہیں۔ آپ چاہیں تو کچھ دن پہن کر دیکھ لیں۔ افاقہ ہو تو اچھا ہے ورنہ ان کہانیوں کو گلے میں پہننے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوگا نا۔

شمیم صاحب: ھوں ں ں، اقبال صاحب، آپ کی بات میں دم ہے۔ واقعی ہمارے رشتہ دار نے جو ان حکیم صاحب کی تعریف کی تھی، بلا وجہ نہیں تھی۔ میں آج ہی ان پرچیوں کا تعویذ بنوا لیتا ہوں۔۔۔ ویسے آپ کے خیال میں عام چمڑے کا بنواؤں یا کسی خاص جانور کے چمڑے کا؟

اقبال صاحب: میرا خیال ہے بس جانور حلال ہو، باقی کیسا بھی ہو چل جائے گا۔ لیکن میں کوئی حکیم نہیں ہوں۔

شمیم صاحب: ارے اقبال صاحب، آپ بھی تقریباً حکیم ہی ہیں۔ آخر خون میں موجود ہے!

اقبال صاحب: ہا ہا ہا، شرمندہ کر رہے ہیں۔ گرین ٹی لیں گے؟

شمیم صاحب: جی بالکل! بہت شکریہ!

مُرغا اور منطِق

(منطِقی مغالطے)

(بس اسٹاپ پر)

ارے محسن صاحب، کہاں آسمان کو تکتے ہوئے آرہے ہیں؟ خیریت تو ہے؟ سعید صاحب نے پوچھا۔

ہاں بھئی، خیریت ہے، خیریت ہے۔ محسن صاحب نے جواب میں کہا۔

اور محسن صاحب، یہ چھتری ہاتھ میں کیوں پکڑی ہوئی ہے؟

محسن صاحب نے ایک نظر اپنے ہاتھ میں موجود چھتری کو دیکھا۔ پھر سامنے کھڑے سعید صاحب کی جانب دیکھا۔ محسن صاحب کے چہرے پر کچھ الجھن کے آثار تھے۔ وہ ایک لیگل فرم میں کلرک تھے۔ سعید صاحب کتاب فروش تھے۔ دونوں کی عموماً بس اسٹاپ پر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔

بھئی، کیا بتائیں، آج منطق کام نہیں کر رہی ہے۔

کیسی منطق؟

ارے بھئی، وہ ہمارے ---ارر--- وہ ہمارا جو مرغا ہے، جب بھی بارش ہوتی ہے، لازماً بانگ دیتا ہے اور پے در پے دیتا رہتا ہے۔ آج صبح بھی مسلسل بانگ دینا شروع ہوگیا۔ ہم نے بھی چھتری اٹھالی کہ باہر بارش ہو رہی ہوگی۔ باہر آئے تو آسمان بس ابر آلود نظر آیا۔ لیکن مرغے پر بھی اعتماد تھا، اس لیے چھتری واپس رکھنے نہیں گئے۔ اب راستہ چلتے ہوئے یہاں تک آ گئے ہیں، لیکن بارش کا نام و نشان نہیں۔ حیرت ہے!

محسن صاحب، اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ آج مرغے کا ایسے ہی بانگ دینے کو جی چاہ رہا ہوگا۔

لیکن، سعید صاحب، یہاں منطق کا معاملہ بھی ہے۔ آپ نے بھی تو منطق پڑھی ہے۔

جی، مگر کیسے؟

ارے بھئی منطق کی رو سے استدلال[۷۵] کچھ یوں ہوگا نا:

اگر بارش ہوگی (ب)، تو مرغا پے در پے بانگ دے گا (پ)

اور مرغا پے در پے بانگ دے رہا ہے (پ مثبت)

اس لیے بارش ہو رہی ہے (ب مثبت)[۷۶]

یعنی اگر کُلیّہ یہ ہے کہ جب بھی بارش ہوگی، ہمارا مرغا پے در پے بانگ دے گا۔ اور آج ہمارا مرغا مسلسل بانگ دے رہا تھا۔ اس کا مطلب باہر بارش ہونی چاہیے تھی۔ اس رو سے ہمارا چھتری ساتھ لینا غلط تو نہیں تھا۔

لیکن، محسن صاحب، منطق کی رو سے یہ نتیجہ کیسے نکلتا ہے، مرغا تو کسی اور وجہ سے بھی بانگ دے سکتا ہے۔ اس بات کو یوں سوچیں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ اگر بارش ہوگی تو محسن صاحب لازماً بس کے بجائے رکشا میں دفتر جائیں گے۔ اور آج بارش ہو رہی ہو تو یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے رکشا لیا ہوگا۔ لیکن اگر کسی اور دن آپ کو رکشے میں دفتر جاتا

---

[۷۵] Argument

[۷۶] If p, then q
But q
Therefore, p

دیکھیں تو ضروری تو نہیں بارش ہو رہی ہو۔ ہوسکتا ہے آپ کو جلدی پہنچنا ہو یا کوئی اور وجہ ہو۔

ھم م م، سعید صاحب، میرا خیال ہے آپ شاید صحیح فرما رہے ہیں۔ 'ب' سے 'پ' کی طرف جایا جاسکتا ہے، لیکن 'پ' سے 'ب' کی جانب جانا مشکل ہے۔

جی محسن صاحب۔ بلکہ عملی زندگی میں 'ب' سے 'پ' کا نتیجہ بھی ہمیشہ نہیں لیا جاسکتا۔ ممکن ہے بارش ہو رہی ہو لیکن آپ کو رکشا نہ ملے اور بس لے کر دفتر جانا پڑے۔

ھم م م، یہ بات بھی درست ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ فقط اس استدلال پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ آئندہ مرغا مسلسل بانگ دے گا تو کھڑکی کا پردہ ہٹا کر بھی دیکھ لیا کریں گے!

جی، محسن صاحب، بالکل منطقی بات ہے!

(اگلا دن)

ارے محسن صاحب، بھاگے بھاگے آرہے ہیں؟ خیریت تو ہے، دیر ہوگئی؟

ارے سعید صاحب، پھر وہ ہمارے --- ارر--- وہ ہمارا جو مرغا ہے اس نے مسئلہ پیدا کر دیا۔

مرغے نے؟ کیوں، کیا ہوا؟

بس، کیا بتائیں، ہر روز عین سورج نکلنے کے وقت ہمارا مرغا لازماً بانگ دیتا ہے۔ ہم فجر سے جاگے ہوئے تھے۔ سورج نکلنے میں وقت تھا، سوچا کہ ذرا سستا لیں۔ بستر پر آ کر لیٹ گئے۔ ذہن میں تھا کہ جب تک مرغا بانگ نہیں دے گا صبح نہیں ہوگی۔ خاصا وقت گزر گیا تو پریشانی ہوئی۔ اٹھے اور پردہ ہٹا کر دیکھا تو سورج کب کا نکل چکا تھا۔ حیرت ہے!

محسن صاحب، اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ آج مرغے کا بانگ دینے کا موڈ نہیں ہو رہا ہوگا۔ ممکن ہے اُس کی طبیعت ناساز ہو؟

نہیں، سعید صاحب، حیرت منطقی استدلال پر ہے۔ لیکن نہیں--- اوہو--- ابھی آپ سے بات کرتے ہوئے خیال آ رہا ہے کہ شاید ہم آج بھی کل کی طرح مغالطہ کر بیٹھے ہیں۔

مغالطہ---؟ وہ کیسے؟

بھئی ہم منطق کی رو سے اس طرح سوچ رہے تھے:

اگر سورج نکلے گا (ب)، تو مرغا لازماً بانگ دے گا (پ)

ابھی مرغے نے بانگ نہیں دی ہے (پ منفی)

اس لیے سورج نہیں نکلا ہے (ب منفی)[۷۷]

سعید صاحب، پس یہاں مغالطہ ہے نا۔ اگر مرغے نے بانگ نہیں دی تو یہ مطلب تو نہیں کہ سورج نہیں نکلا۔ اور جیسا کہ آپ نے فرمایا، ممکن ہے ہمارے مرغے کی طبیعت ناساز ہو، یا کوئی اور چکر ہو---

البتہ سعید صاحب، آپ سے بات کرتے ہوئے یہ خیال آ رہا ہے کہ ہم اپنے مرغے کو ایک عرصے سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے بانگ دینے سے سورج نہیں نکلتا ہے، لیکن وہ سورج نکلنے کی خبر درست دیتا رہا ہے۔ یوں امکان[۷۸] کے لحاظ سے بات کی جائے تو مرغے پر اعتبار کیا جاسکتا ہے، کبھی کبھار کی بھول چوک اپنی جگہ سہی۔ یعنی ہم سوچ رہے

---

[۷۷] If p, then q
Not q
Therefore, not p

[۷۸] Probability

ہیں کہ یہاں 'پ' سے 'ب' کی جانب بھی خاصے اطمینان کے ساتھ جایا جاسکتا ہے۔
مرغے کے بانگ دینے پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سورج نکل گیا ہوگا اور بانگ نہیں دی تو سورج ابھی نہیں نکلا ہوگا۔ اتنے عرصے سے یہی منطق کام آتی رہی ہے۔

ھم م م --- محسن صاحب، آپ کی بات میں وزن ہے۔ اور اس لحاظ سے آپ نے کل جو نتیجہ اخذ کیا تھا وہ بھی مغالطہ نہیں تھا۔ یعنی اگر آپ کا مرغا پے در پے بانگ دینے لگے تو امکان ہے باہر بارش ہو رہی ہوگی۔ محسن صاحب، آپ نے تو مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے--- البتہ، کھڑکی کے پردوں کو ہٹا کر دیکھنا پھر بھی ضروری ہوگا!

جی، سعید صاحب، یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے!

اوہ--- لیجیے محسن صاحب، میری بس آ گئی۔ اس موضوع پر مزید بات کریں گے۔ لیکن اس دوران آپ اپنے مرغے کی خبر لیجیے۔ طبیعت ناساز ہو تو کچھ دوا دارو کیجیے۔ ورنہ اُسے تھوڑی سی منطق پڑھا دیجیے!

ہا ہا ہا، جی ضرور! اپنا خیال رکھیے گا!

جی آپ بھی!

محسن صاحب نے میاں جی کو منطِق پڑھائی

(منطِقی مغالطے)

شام کو محسن صاحب گھر لوٹے تو ذہن پر مرغے کی فکر سوار تھی۔ کہیں طبیعت واقعی ناساز تو نہیں۔ مرغے کو وہ 'میاں جی' کہہ کر بلاتے تھے۔ صحن میں داخل ہوتے ہی محسن صاحب نے میاں جی کو آواز دی۔ میاں جی بھی دوڑے چلے آئے اور اُن کے پاؤں کے آس پاس گھومنے لگے۔

دیکھنے سے تو میاں جی کی معمول کی آن بان شان سب قائم تھی۔ وہ بانگ ایک لَے میں دیا کرتے ہیں، جو اس وقت بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ دی گئی۔ محسن صاحب نے میاں جی کے آگے گیہوں کے دانے ڈالے تو وہ بھی شوق سے کھانے لگے۔ محسن صاحب نے سوچا کہ میاں جی دیکھنے میں تو نارمل دکھائی دے رہے ہیں لیکن احتیاطاً وہ انھیں دو تین دن آنڈر آبزرویشن رکھیں گے۔

پھر اچانک انھیں سعید صاحب کی بات یاد آئی کہ اگر مرغے کی طبیعت ناساز نہ ہو تو اسے تھوڑی سی منطق پڑھا دیجیے۔ خیر وہ تو مذاق تھا۔ لیکن محسن صاحب نے سوچا کہ وہ مسلسل دو دن سے منطقی مخمصوں میں پھنسے ہیں، بہتر ہوگا اپنے پرانے اسباق کو دہرا لیں۔ اور میاں جی بھی سامنے موجود تھے۔ محسن صاحب کا اپنا تجربہ تھا کہ کسی کو پڑھاتے ہوئے مطالب بہتر سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ سو محسن صاحب اپنے کمرے میں گئے، الماری سے اپنی منطق کے نوٹس والی کاپی نکالی، اور صحن میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

محسن صاحب میاں جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے،

میاں جی، کچھ منطق پر بات کریں---؟

میاں جی گیہوں کھانے میں مگن تھے، محسن صاحب کی آواز سنی تو اپنے سر کو اٹھایا اور ایک جانب موڑ کر محسن صاحب کو غور سے دیکھا۔ پھر دوبارہ گیہوں پر جھک گئے۔ محسن صاحب نے سوچا کہ میاں جی اگرچہ کھانے میں مشغول ہیں، لیکن متوجہ ہیں۔

محسن صاحب نے سبق شروع کیا۔

منطق میں دلائل اور مُغالطے پڑھنے کا فائدہ

میاں جی، کسی کو کسی بات پر قائل کرنا ہو تو دلیل کے ساتھ بات کرنے سے اثر پڑتا ہے۔ انسان خود بھی غور و فکر کے دوران دلیلوں سے کام لیتا ہے۔ اگر دلیلوں اور مغالطوں کی پہچان ہو تو فکر میں نکھار آتا ہے اور امکان ہے سامنے والے پر بھی بہتر اثر پڑے۔

مثلاً تمہیں قائل کرنا آسان ہے۔ تمہیں گیہوں پسند ہے۔ یہی دلیل تمہیں یہاں پاس بلانے اور یہاں روکے رکھنے کے لیے عموماً کافی ہوتی ہے۔ لیکن اگر تم ہمیں دلیل دینا چاہو تو صرف گیہوں سے کام نہیں چلے گا۔ یہ تمہارا مغالطہ ہوگا۔ ہاں اگر تم مرغے کے بجائے مرغی ہوتے تو دیسی انڈے ہمارے لیے خاصی وزنی دلیل ہوتے! لیکن تمہیں مرغا ہونے کے ناتے زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ مثلاً یہی کہ بانگ دینے میں مغالطے کرنا بند کرو اور اپنی پرانی روٹین پر واپس آجاؤ!

لیکن خیر، کوئی بات نہیں، جب تک تمہاری بانگ معمول پر نہیں آتی، تم چاہو تو ہمارے ساتھ کچھ دوسری قسم کی دلیلوں اور مغالطوں کو اچھی طرح سمجھ لو۔ شاید کام آ جائیں۔

دعویٰ اور دلیل

میاں جی، منطقی تجزیے کے لیے ایک بنیادی شرط اپنی سوچ پر نظر رکھنے کا ہنر ہے۔ یعنی ایک تم ہو اور ایک تمہارے ذہن میں آنے والی سوچیں ہیں۔ جو سوچ بھی ذہن میں آئے اس پر نظر رکھو۔ سامنے سے بھی کوئی مشورہ دے، کوئی توجیہ دے، کوئی استدلال پیش کرے، تو ایک لمحے کے لیے توقف کرو۔ اور غور کرو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بات میں **دعویٰ** کیا ہے اور اس دعوے کے لیے **دلیل** کیا دی گئی ہے۔ اور دونوں میں ربط کیا ہے۔ یہ منطق میں تحلیلی تجزیہ کرنا کہلائے گا۔

استدلال = دعویٰ + دلیل[۷۹]

مثلاً پڑوس کی پروفیسر آئے اور۔۔۔ ارے پروفیسر بلّی۔۔۔ وہی جو صحن کی دیوار پر سر جھکائے، خراماں خِراماں چلتی ہوئی ایک گھر سے دوسرے گھر آتی جاتی ہے۔ ہاں تو پروفیسر تمہارے پاس آئے اور کہے کہ چند دن فلاں پودے کے ساتھ اُگنے والی گھاس کھا لو۔ تو بتاؤ، تم کیا جواب دو گے؟

میاں جی نے ذرا سا سر کو اٹھایا، ایک لمحے کے لیے توقف کیا، لیکن پھر فوراً سر جھکا کر گیہوں کھانے لگے۔

ہاں، میاں جی، شاید تم کہو کہ بھلا میں وہ گھاس کیوں کھاؤں؟ تم نے پروفیسر کا دعویٰ تو سمجھ لیا کہ وہ خاص گھاس کھانی چاہیے، لیکن تم ساتھ میں دلیل بھی مانگ رہے ہو کہ کیوں کھائی جائے۔ یعنی تم دعویٰ اور دلیل کے فرق کو سمجھتے ہو۔ پس تم تو منطقی انداز میں سوچتے ہو!

---

[۷۹] Argument = Claim + Proof/Basis/Support

اب یہ دیکھو کہ پروفیسر کوئی دلیل بھی دیتی ہے یا نہیں۔ اور جو بھی دلیل دے اس میں کتنا وزن ہے۔ اور کیا وہ دلیل، دعوے سے مطابقت بھی رکھتی ہے کہ نہیں۔

سو جب تم پروفیسر سے پوچھو کہ وہ گھاس کیوں کھائی جائے، تو فرض کرو وہ کہے کہ تم بیمار لگ رہے ہو۔ میں بھی جب بیمار پڑتی ہوں تو چند دن وہ گھاس کھا لیتی ہوں۔ افاقہ ہوجاتا ہے۔

ہاں اب بتاؤ، اس دلیل میں کتنا وزن ہے؟

لیکن میاں جی تو اسی طرح گیہوں کھانے میں مصروف تھے، جیسے انھیں پروفیسر بلّی کی دلیل سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔

ہاں میاں جی، شاید تم کہو کہ صرف بلّی کے الفاظ کا تجزیہ کرنا کافی نہیں، پیچھے نیّت بھی دیکھنی ہوگی۔ بالکل، تمھاری بات بھی منطقی ہے۔ یہاں دعویٰ اور دلیل کے ساتھ ساتھ سامنے والے کی نیّت کو بھی مدّنظر رکھا جانا چاہیے۔

لیکن اگر تم نے فوراً کہہ دیا کہ جاؤ جاؤ، اپنا کام کرو! تو بتاؤ، یہ اچھے اخلاق ہوں گے؟ خاص طور پر جب بات خلوص کے ساتھ کہی گئی ہو، پروفیسر بلّی کا تم پر جھپٹنے کا کوئی ارادہ بھی نہ ہو، اور وہ تمھاری ٹھونگ کی قوت سے بھی واقف ہو۔

خیر، یہ تو تم نے فیصلہ کرنا ہے کہ کیا جواب دو گے اور کس طرح دو گے۔ لیکن جواب دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پروفیسر نے جو دلیل پیش کی ہے، اس کا بھی تجزیہ کرو اور پھر مناسب جواب دو۔

ہاں تو بتاؤ، تم پروفیسر کی بات کا کیسے تجزیہ کرو گے؟

میاں جی نے اپنا سر اٹھایا۔ چہرہ موڑ کر ایک نظر محسن صاحب پر ڈالی۔ پھر صحن کی جانب کچھ لمحے تکتے رہے۔ معلوم نہیں ان کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ پھر دوبارہ گیہوں پر جھک گئے۔

دلیل کی چند قسمیں

میاں جی، تمہیں اس طرح کا تجزیہ کرنا قدرے آسان لگے گا اگر تم دلیل کی کچھ قسموں کو پہچاننے لگو۔ اور یہ بھی کہ ان میں عموماً کیا کیا مغالطے ہوتے ہیں۔ خود بھی مغالطوں سے بچو گے اور دوسروں کے مغالطوں میں بھی نہیں آؤ گے۔

(۱) عِلّت

میاں جی، دلیلوں میں سے ایک قسم یہ ہے کہ کسی عمل یا چیز کو کسی اثر یا نتیجے سے جوڑا جائے۔ مثلاً تم نے دیکھا کہ پروفیسر بلّی نے گھاس کے استعمال کو افاقے سے جوڑا۔ یعنی جب وہ اس خاص گھاس کو استعمال کرتی ہے تو بیماری غائب ہوجاتی ہے۔

دعویٰ: میاں جی کو بیماری میں وہ خاص گھاس کھانی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ وہ گھاس دوا کا کام کرتی ہے۔

یہاں تم چاہو تو پروفیسر کی اس دلیل پر کئی سوالات اٹھا سکتے ہو۔ مثلاً تم پوچھ سکتے ہو کہ پروفیسر اتنے یقین سے اس گھاس کی افادیت کے بارے میں کیسے جانتی ہے؟ خود اس نے کتنی بار اس گھاس کا استعمال کیا ہے؟ فرض کرو اس نے صرف ایک یا دو بار استعمال کیا ہے، تو کیا یہ کافی ہوگا؟ اور کیا یہ ممکن نہیں کہ بیماری وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی چلی گئی ہو، لیکن پروفیسر سمجھ رہی ہو کہ اتنے دن گھاس کھانے سے دور

ہوگئی؟ اور کیا یہ بھی ممکن نہیں کہ پلاسیبو افیکٹ[۸۰] ہو، صرف نفسیاتی اثر ہو۔ یعنی صرف اس گھاس کی افادیت پر اعتقاد ہونے کی وجہ سے طبیعت بہتر ہوگئی ہو، ورنہ گھاس کا اپنا کوئی اثر نہ ہو؟

تم دیکھ رہے ہو کہ اس طرح کے کئی سوالات عِلّت کے حوالے سے پوچھے جا سکتے ہیں۔ البتہ ضروری نہیں کہ پروفیسر نے کوئی مغالطہ کیا ہو۔ ممکن ہے وہ تمہیں جواب میں کہے کہ صرف ایک دو بار نہیں، ایک عرصہ سے وہ اس گھاس کو بطور دوا استعمال کرتی آ رہی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ پروفیسر اپنی نیچرل اِنسٹنک[۸۱] یا اِنٹوِیشن[۸۲] کی بنا پر اس گھاس کی افادیت کی خبر دے رہی ہو۔ خیر، ان میں سے ہر دلیل میں کتنا وزن ہے، اس پر مزید گفتگو ہوسکتی ہے۔

البتہ غور کرو تو اس دلیل میں ایک پنہاں پہلو بھی محسوس ہوتا ہے جو اس استدلال میں مقدّمہ یا کُلیّہ کا کام کر رہا ہے اور دلیل کو دعوے سے جوڑ رہا ہے۔ یعنی کیا یہاں فرض کیا جا رہا ہے کہ جب بھی بیمار پڑیں تو صحت یابی کے لیے دوا کھانی چاہیے؟ تحلیلی تجزیے میں ایسے پنہاں پہلوؤں کو بھی بقدر ضرورت زیر بحث لایا جاتا ہے۔

دعویٰ: میاں جی کو بیماری میں وہ خاص گھاس کھانی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ وہ گھاس دوا کا کام کرتی ہے۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور جب بیمار پڑیں تو صحت یابی کے لیے دوا کھانی چاہیے۔

---

[۸۰] Placebo Effect

[۸۱] Natural instinct

[۸۲] Intuition

سو میاں جی، یہاں تم بجا طور پر سوال اٹھا سکتے ہو کہ کیا ضروری ہے تمہاری بیماری دوا کھا کر ہی دور ہو۔ بعض بیماریوں کے لیے پرہیز کافی ہوتا ہے۔ بعض کے لیے کھانے پینے اور طرز زندگی میں تبدیلی کام کر جاتی ہے۔ اور پروفیسر بلّی نے تو تمہیں نیچرل دوا تجویز کی ہے ورنہ ہم انسان تو دوا کے نام پر پتا نہیں کون کون سے کیمیکل اپنے اندر انڈیل لیتے ہیں۔ ایک بیماری ابھی ختم نہیں ہوتی کہ دوسری سائڈ افیکٹ کے طور پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ خیر، یہاں پنہاں پہلو سے متعلق اور بھی کئی سوالات پوچھے جا سکتے ہیں۔ لیکن عِلّت کے زاویے سے پروفیسر کی دلیل کا کیسے تجزیہ کیا جا سکتا ہے، اس کا تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا۔

(۲) مثال

میاں جی، دلیلوں میں سے ایک قسم یہ ہے کہ کوئی اپنی مثال دے یا کسی اور کی مثال دے۔ مثلاً تم نے دیکھا پروفیسر بلّی نے اپنے دعوے کے حق میں خود اپنی مثال دی۔ یعنی وہ بھی بیماری کی حالت میں اس خاص گھاس کو استعمال کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے پروفیسر دوسری بلّیوں کی بھی مثال دے۔

دعویٰ: میاں جی کو بیماری میں وہ خاص گھاس کھانی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ دوسرے بھی یہی کرتے ہیں۔

یہاں کیا یہ فرض کیا جا رہا ہے کہ جو چیز بلّی کرے، مرغے کو بھی کرنی چاہیے؟ جو چیز بلّی کے لیے افادیت رکھتی ہے وہ مرغے کے لیے بھی مفید ہوگی؟ یہاں تم نے اسی اسمپشن پر سوال اٹھانا ہے! ہاں ضروری نہیں پروفیسر غلط ہو، لیکن ذرا تفصیل کا مطالبہ تو کر سکتے ہو۔

اب ممکن ہے پروفیسر جواب میں کہے کہ اس نے وہ گھاس دوسرے مرغوں کو بھی استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور صرف ایک دو نہیں کئی مرغوں کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور وہ اپنی بات کو یوں بیان کرے کہ اگر وہ خاص گھاس دوسرے مرغوں کے لیے مفید ہے تو تمہارے لیے بھی مفید ہوگی۔

دعویٰ: میاں جی کو بیماری میں وہ خاص گھاس کھانی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ دوسرے مرغے بھی یہی کرتے ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور جو کام کرنا دوسرے مرغوں کے لیے درست ہے وہ میاں جی کے لیے بھی درست ہوگا۔ (یا جو گھاس دوسرے مرغوں کے لیے مفید ہے وہ میاں جی کے لیے بھی مفید ہوگی۔)

ہاں تو میاں جی، اب کیا خیال ہے؟

میاں جی نے ایک لحظے کو توقف کیا لیکن اسی طرح گیہوں پر جھکے رہے۔

ہاں میاں جی، جس طرح پروفیسر کی نیّت کے حوالے سے سوال کیا جاسکتا ہے، اسی طرح یہ سوال بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا نہیں۔ یعنی کیا واقعی دوسرے مرغے بھی اس گھاس کو استعمال کرتے ہیں؟ اور وہ بھلا پروفیسر کو کیوں آ کر بتانے لگے؟

تمہارا اعتراض بجا ہے۔ لیکن میاں جی، فرض کرتے ہیں پروفیسر کی نیت میں کھوٹ نہیں اور وہ بات بھی سچ کہہ رہی ہے، اب بتاؤ، تم اس دلیل کے بارے میں کیا کہو گے---؟

مثلاً کیا یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ جو چیز پروفیسر کے جاننے والے دوسرے مرغوں کے لیے مفید ہو، کیا ضروری ہے تمہارے لیے بھی مفید ہو؟

ہم انسانوں کی بات کی جائے تو طب و حکمت کی روایات میں لوگوں کے مختلف مزاج تشخیص کیے گئے ہیں۔ مثلاً لوگ گرم مزاج کے ہوتے ہیں، بلغمی مزاج کے ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ایک شہد جس کی تاثیر انتہائی گرم ہو، ممکن ہے کسی خاص موسم میں بلغمی مزاج والوں کے لیے لینا مناسب ہو، لیکن گرم مزاج والوں کے لیے مناسب نہ ہو۔ پھر انسانوں میں صرف مزاج کا فرق نہیں ہوتا، عمر، شغل، عادات، خاندان، ماحول، اور بہت ساری دیگر باتوں کا بھی فرق ہوتا ہے۔ مرض اور دوا دونوں کی تشخیص میں ان ساری باتوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

سو میاں جی، ہمیں نہیں معلوم مرغوں میں بھی مزاج کی کوئی تفریق پائی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن اگر ہو تو تم بجا طور پر سوال اٹھا سکتے ہو کہ جو دوا پروفیسر بلّی کے شناسا مرغوں کے لیے مفید ہو، ضروری نہیں تمہارے لیے بھی مفید ہو۔

ویسے یہ بھی ممکن ہے تم پروفیسر بلّی کی مثال کے مقابلے میں کوئی جوابی مثال لے آؤ۔ مثلاً تم کچھ دوسرے مرغوں کا حوالہ پیش کر دو جنھوں نے اس خاص گھاس کو بیماری میں استعمال کیا لیکن کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا۔

سو میاں جی، تم نے دیکھا کہ جب دلیل کے طور پر محض دوسروں کی مثال دی جائے تو کئی طرح کے سوالات کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی کیا دی گئی مثال متعلقہ یا ریلے ونٹ[۸۳] ہے کہ نہیں، کتنی مثالیں دی گئی ہیں، اور کیا کوئی جوابی مثال بھی پائی جاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

---

[۸۳] Relevant

البتہ ممکن ہے پروفیسر آغاز ہی میں کہہ دے کہ مجھے تو افاقہ ہوا ہے، تم بھی چاہو تو اس گھاس کو استعمال کر کے دیکھ لو۔ آزمائش شرط ہے! ہاں پھر یہ قدرے مختلف دلیل ہوجائے گی۔

ویسے میاں جی، تمہیں دیکھتے ہوئے لگتا ہے کہ اگر مرغوں میں مزاج کی تفریق پائی جاتی ہو تو تم شاید گرم مزاج کے حامل ہو گے۔

نہیں، ویسے ہی ذہن میں بات آگئی تھی۔ اگلی دلیل پر چلیں---؟

(۳) سند

میاں جی، دلیلوں کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی چیز یا شخص کو قابلِ بھروسہ یا اتھارٹی کے طور پر لیا جائے۔ مثلاً پروفیسر تم سے کہے کہ اچھا، میری بات پر اعتبار نہیں تو قصائی سے پوچھ لو کہ گھاس کھانا تمہارے لیے مفید ہوگا یا نہیں، قصائی تو ہر طرح کے جانور کو جانتا ہے، اس نے تو جانوروں کو اندر باہر ہر طرح سے دیکھا ہوا ہے۔ اور میاں جی، فرض کرو پروفیسر، قصائی سے تحریری نسخہ بھی لے آئے کہ وہ گھاس واقعی مفید ہے۔ پھر کیا جواب دو گے؟

دعویٰ: میاں جی کو بیماری میں وہ خاص گھاس کھانی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ افادیت کی سند موجود ہے۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور سند پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

لیکن میاں جی تو غیر محسوس انداز میں چند قدم دور چلے گئے تھے۔

محسن صاحب میاں جی کو کچھ لمحے تکتے رہے، پھر کہنے لگے،

ہاں میاں جی، ہم قصائی کے معاملے میں تمہاری فطری حساسیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ تمہاری یہ حساسیت قطعی غیر معقول نہیں ہے۔ بالکل منطقی ہے۔ ہم تم سے نہیں کہیں گے کہ تحلیلی تجزیہ کرتے ہوئے اپنے ان جذبات کو پس پشت ڈال دو۔

چنانچہ یہاں پہلا اعتراض یہی کیا جانا چاہیے کہ قصائی کی اس دلیل میں شمولیت کا کیا جواز ہے۔ مثلاً تم بجا طور پر سوال اٹھا سکتے ہو کہ قصائی کب سے جانوروں کے ڈاکٹر ہوگئے ہیں۔ وہ کب سے اس معاملے میں اتھارٹی بن گئے ہیں کہ ان کی رائے کا اعتبار کیا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کوئی قصائی جانوروں کو پالنے کا تجربہ رکھتا ہو اور قصائی ہونے کے علاوہ دوسری صلاحیتیں بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہاں اُسے محض قصائی ہونے کی بنا پر سند کے طور پر نہیں لیا جاسکتا۔

البتہ تم شاید کہو کہ بہت سے ڈاکٹر بھی اندر سے قصائی ہوتے ہیں اور حتیٰ ڈاکٹروں کو بھی ہمیشہ سند کے طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ بھئی اس بات سے تو ہم بھی اتفاق کریں گے۔

لیکن فرض کرو کوئی ڈاکٹر یا کسان، سند ہونے کے معیار پر واقعی پورا اترتا ہو، معاملہ فہم بھی ہو اور کوئی ذاتی مفاد یا لالچ بھی نہ ہو، اور پروفیسر بلّی اس سے تصدیق شدہ نسخہ لے آئے اور اس بنا پر تمہیں مشورہ دے کہ وہ خاص گھاس کھائی جائے، تو بات پر غور کرو گے یا نہیں؟

لیکن میاں جی تو اسی طرح دور رہے اور اب گیہوں کو خال خال ہی چگ رہے تھے۔

محسن صاحب نے میاں جی کے موڈ کو دیکھتے ہوئے سوچا کہ کم از کم کچھ دلیلوں پر گفتگو ہوگئی۔ اس بات کا بھی ذکر آگیا کہ ایک دلیل میں پنہاں پہلو بھی ہو سکتے ہیں جو مثلاً مقدّمہ یا کلیّہ کا کام کر رہے ہوں۔ اور میاں جی سے گفتگو کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ تناظر اور دیگر مُضمَرات کی بحث بھی سامنے آگئی۔ مثلاً دیکھا جائے کہ استدلال کا سیاق و سباق کیا

ہے، کون پیش کر رہا ہے، کیسے پیش کر رہا ہے، پیچھے نیّت اور مفادات کیا ہو سکتے ہیں، بحث کو کس جانب لے جایا جا رہا ہے، اور اس کے اثرات کیا ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح انسان خود اپنی سوچ پر بھی نظر رکھے کہ وہ کس بنیاد پر کسی دلیل کو قبول یا رد کر رہا ہے اور اس معاملے میں اس کے جذبات، عقائد، تجربات، اور رجحانات وغیرہ کیا اثر ڈال رہے ہیں۔

پس کسی استدلال کا جامع تحلیلی تجزیہ کیا جائے تو دعوے اور دلیل کے ساتھ ساتھ تناظر اور دیگر مضمرات کو بھی سامنے رکھا جائے۔

جامع تحلیلی تجزیے میں استدلال = دعویٰ + دلیل + تناظر/ مضمرات[۸۴]

اچانک محسن صاحب کو خیال آیا کہ صبح سعید صاحب کے ساتھ مغالطے پر جو بات ہوئی تھی، وہاں استدلال کی شکل مختلف تھی۔ لیکن دعویٰ اور دلیل وہاں بھی تھے۔ اس بات کا بھی میاں جی سے تذکرہ کر دیں۔ اور میاں جی بھی شاید دلچسپی لیں کیوں کہ ان کا ذکر بھی آیا تھا۔

محسن صاحب نے میاں جی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا،

میاں جی، دلیلوں کی کچھ قسموں کو تم نے دیکھ لیا۔ ان کے علاوہ اور بھی قسمیں ہیں۔ خود ان قسموں کو بھی الگ الگ ناموں اور انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور ان کے مابین اوورلیپس[۸۵] کو بھی تم نے محسوس کیا ہوگا۔

ہم سوچ رہے ہیں کہ کچھ استدلال کی شکل پر بھی بات کر لیں۔ یوں ہماری دلیلوں اور مغالطوں کی بحث بھی کسی منزل تک پہنچ جائے گی۔ اور تمہیں تو اس میں دلچسپی ہو گی

---

[۸۴] In Comprehensive Analysis, Argument = Claim + Proof/Basis/Support + Context and Other Relevant Considerations

[۸۵] Overlaps

کیوں کہ آج صبح سعید صاحب سے اس موضوع پر بات کرتے ہوئے تمہارا ذکر بھی آیا تھا۔ جو تم دو دن سے بانگ دینے میں مغالطے کر رہے ہو، اسے ہم نے---

میاں جی نے یکدم سر اٹھایا اور چہرے کو ایک جانب موڑ کر محسن صاحب کو غور سے دیکھنے لگے۔

ارے، وہ ہمارا مطلب ہے کہ تمہارے مغالطے---یعنی ہم سعید صاحب سے تمہاری شکایت تھوڑی کر رہے تھے، ہم تو ایک علمی بحث کر رہے تھے جس میں تمہارا ذکر---

ارے ارے کہاں چل دیے؟ ارے اس میں ناراضی والی کیا بات ہے؟

ارے کہاں---؟

لیکن میاں جی نے تو اپنا منہ پھیر لیا تھا۔ وہ سر اونچا اٹھائے چلتے چلتے صحن کی دیوار کے پاس گئے، اپنے دونوں پروں کو پھیلایا، زور سے جھٹکا، اور ایک آن میں دیوار کے اوپر پہنچ گئے۔ دیوار پر میاں جی نے ایک لحظے کے لیے اپنا توازن قائم کیا اور پھر دوسری جانب کود گئے۔

پیچھے محسن صاحب انھیں آواز دیتے رہ گئے۔

میاں جی کے لیے مزید دلیلیں

(منطقی مغالطے)

میاں جی! دیکھو اتنی بے اعتنائی بجا نہیں! بس یہ ناراضی ختم کرو!

محسن صاحب اگلے دن دفتر سے لوٹنے کے بعد ایک بار پھر گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں منطق کے نوٹس والی کاپی تھی۔ سامنے بڑے سے گتّے پر گیہوں کے دانے پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن میاں جی تو بس آس پاس ٹہل رہے تھے۔

میاں جی! کچھ خیال کرو، لوگ باتیں بنانے لگتے ہیں، بلکہ محاورے بنانے لگتے ہیں۔ جیسے تم نے سنا ہوگا، بھینس کے آگے بین بجانا۔ اب بتاؤ تمہیں اچھا لگے گا کہ کوئی کہے، مرغے کو منطق پڑھانا!

چچ۔۔۔ دیکھو، معاملے کی نزاکت کو سمجھو! لوگوں کا تو کام ہی باتیں بنانا ہے۔ بھینس کے لیے بھی محاورہ بناتے ہوئے کس نے خیال کیا کہ ممکن ہے بھینس کو اس دن نزلہ ہو، کان بند ہوں، اس لیے بین کی آواز پر جواب نہ دیا ہو۔ یا شاید بین سے نکلنے والی آواز پسند نہ آئی ہو۔ یا کوئی اور وجہ ہو۔ لوگوں کو بس اپنی مرضی کا جواب نہ ملا تو بھینس کے خلاف محاورہ گھڑ لیا! اب کہیں ایسا نہ ہو اس علمی گفتگو سے تمہاری بے اعتنائی کو دیکھ کر کہا جانے لگے کہ یہ تو مرغے کو منطق پڑھانا ہوا! ہاں بتاؤ تمہیں اچھا لگے گا۔۔۔؟

لیکن میاں جی پر اس جذباتی قسم کی دلیل کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، وہ اپنی مرضی سے صحن میں ٹہلتے رہے۔

اچھا میاں جی! سچی بات یہ ہے کہ تمہارے ساتھ منطق کو دہرانے کا اپنا لطف ہے۔ نئے مطالب بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ہم خود اکیلے بیٹھیں تو گھنٹوں لگ جائیں۔ کہیں نوٹس میں کوئی حاشیہ آ گیا اور ذہن کہاں سے کہاں نکل گیا!

اور ہم کونسا منطق کی کوئی مشکل بحث تمہارے سامنے لا رہے ہیں۔ نہ اب تک ارسطو اور ابن سینا وغیرہ کا نام لیا ہے۔ نہ ان پر تنقید و ترمیم کا کوئی ذکر کیا ہے۔ اور نہ مشرق و مغرب کے دوسرے مکاتبِ منطق کی کوئی بات چھیڑی ہے۔ ہمیں معلوم ہے ایسی گفتگو کے لیے تمہیں گیہوں نہیں، بادام پستے کھلانے پڑیں گے۔ اور خود ہمیں بھی اتنا کچھ سوچنے کے لیے نہار منہ بادام کھانے پڑیں گے۔

ہم تو بس دلائل اور مغالطوں کی گفتگو کو کسی منزل تک لے جانا چاہتے ہیں۔ ہاں تمہیں اعتراض ہے کہ سعید صاحب والی بات نہ کریں، تو لو، نہیں کریں گے۔ اور نہ تمہاری بانگ کا کوئی ذکر کریں گے۔ بس، اب تو مان جاؤ!

اچھا کچھ گیہوں منہ میں ڈالو!

محسن صاحب نے اپنی کرسی کے پاس پڑے تھیلے میں سے مزید گیہوں نکال کر گتّے پر ڈال دیے۔ میاں جی کچھ قریب آ گئے اور قدرے تامل کے بعد نئے گیہوں میں سے پسند کے دانے چگنے لگے۔

محسن صاحب نے موقع غنیمت جانا اور اپنی گفتگو کا آغاز کر دیا۔

تو میاں جی تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے دلیلوں کی کچھ قسموں پر بحث کی تھی۔ آج کی گفتگو میں بھی وہ قسمیں سامنے آئیں گی لیکن مختلف ترکیبوں[٨٦] اور نئی مثالوں کے ساتھ۔ نئی مثالوں سے بات اور بھی واضح ہوجائے گی اور کچھ نئے پہلو بھی سامنے آ جائیں گے۔ یہاں

---

[٨٦] Combinations

ہم شناخت میں آسانی کے لیے ان ترکیبوں کو دلیل کی الگ الگ قسموں کے طور پر لیں گے۔

(الف) دوسرے سب یہی کر رہے ہیں

میاں جی، دلیلوں میں ایک دلیل یہ ہے کہ کسی کام کے جواز کے لیے دوسروں کی مثال یا سند پیش کی جائے کہ دوسرے سب یہی کر رہے ہیں۔ یہاں 'دوسرے سب' سے مراد متعلقہ یا ریلے ونٹ افراد ہیں۔ یہ برادری، محلّے، علاقے وغیرہ کے لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔ عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد بھی ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر یوں کہا جائے کہ 'سب یہی کرتے ہیں' تو مراد عرصہ دراز سے قائم روش بھی ہوسکتی ہے، کہ اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے، یہ نسل در نسل کا تجربہ ہے، چنانچہ تمھیں بھی یہی کرنا چاہیے۔

ہاں ممکن ہے یہ دلیل انھی الفاظ کے ساتھ سننے میں نہ آئے، لیکن عملاً لوگ اس دلیل کو پیش بھی کرتے ہیں اور قبول بھی کرتے ہیں۔

مثلاً ابھی کوئی گھر کے دروازے پر آئے اور کہے کہ یہ تیل مارکیٹ میں نیا آیا ہے، اسے استعمال کریں۔ محلّے میں دوسرے سب یہی تیل استعمال کر رہے ہیں۔

یا الیکشن کے دنوں میں کوئی آئے اور کہے کہ فلاں شخص کو ووٹ دیں۔ محلّے میں دوسرے سب اسے ہی ووٹ دے رہے ہیں۔

ہاں تو میاں جی، اگر تم میری جگہ ہو تو پہلی مثال میں کیا جواب دو گے؟

میاں جی کا سر گیہوں پر جھکا رہا، البتہ انھوں نے چگتے ہوئے ذرا توقف ضرور کیا۔

ہاں میاں جی، تمھیں یاد ہے! پہلے ذرا توقف کرنا ہے۔ اپنی سوچ پر نگاہ رکھنی ہے۔ سامنے والے کی بات پر غور کرنا ہے۔ اگر تحلیلی تجزیہ کر رہے ہو تو دیکھنا ہے کہ دعویٰ کیا ہے،

دلیل کیا ہے۔ دلیل میں کتنا وزن ہے اور دعوے سے کتنا مطابقت رکھتی ہے۔ اور تناظر اور دیگر مُضمرات بھی ذہن میں رہیں۔

سو ہمارے دروازے پر آنے والے کا **دعویٰ** یہ ہے کہ فلاں تیل استعمال کریں۔ اور **دلیل** یہ ہے کہ دوسرے سب یہی تیل استعمال کر رہے ہیں۔

دعویٰ: آپ فلاں تیل استعمال کریں۔

دلیل: کیوں کہ دوسرے سب یہی تیل استعمال کر رہے ہیں۔

ہاں میاں جی، اب دیکھو کہ دی گئی دلیل میں کتنا وزن ہے ؟

مثلاً ممکن ہے تم سوال کا آغاز یہاں سے کرو کہ آنے والے کو کیسے پتا چلا کہ محلّے میں دوسرے سب یہی تیل استعمال کر رہے ہیں؟ اس نے کتنے افراد سے پوچھا؟ کتنوں کو گنا؟ کتنوں کو تولا؟

لیکن فرض کرو دروازے پر آنے والا ثبوت دکھائے کہ محلّے کے اسّی فیصد لوگ اس تیل کو استعمال کر رہے ہیں۔ مثلاً اس نے دکانداروں سے پوچھا، گھر گھر جا کر سروے کیا، وغیرہ۔

ہاں تو پھر کیا جواب دو گے---؟

البتہ ممکن ہے تم اپنے سوالات کا آغاز یہاں سے نہ کرو، بلکہ اس دلیل کے پنہاں پہلو سے کرو جو زیادہ بنیادی سوال ہے۔ مثلاً کیا یہاں اکثریت کو معیار یا سند کے طور پر لیا جا رہا ہے ؟

دعویٰ: آپ فلاں تیل استعمال کریں۔

دلیل: کیوں کہ دوسرے سب یہی تیل استعمال کر رہے ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور دوسرے سب یہی تیل استعمال کر رہے ہیں تو انتخاب درست ہی ہوگا۔

لیکن معیار اکثریت نہیں، تیل کا اچھا ہونا ہے۔ اسیّ فیصد لوگ بھی اس تیل کو استعمال کر رہے ہوں تو بھی ضروری نہیں وہ تیل واقعی اچھا ہو۔ لوگ تو اشتہار دیکھ کر بھی چیزوں کو استعمال کرنے لگتے ہیں۔ یا سستا ہونے کی وجہ سے بھی چیزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ورنہ ہر مشہور تیل صحت کے لیے اچھا تو نہیں ہوتا۔ اور آج کل تو تیل میں کیا کیا ملاوٹیں نہیں ہوتی ہیں۔ پس ضروری تو نہیں لوگوں کی اکثریت ہمیشہ درست انتخاب کرے۔

ہاں یہ بھی ضروری نہیں کہ اکثریت ہمیشہ غلط انتخاب کرے۔ مثلاً ممکن ہے وہ تیل واقعی اچھی کوالٹی کا ہو اور اسی لیے لوگوں میں پسند کیا جا رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تیل نیا ہو لیکن بنانے والی کمپنی عرصہ دراز سے قائم ہو، اور لوگ اس کمپنی پر اعتماد کی وجہ سے وہ نیا تیل ٹرائی کر رہے ہوں۔ بہرحال، یہاں احتیاط لازم ہے، خاص طور پر جب دلیل کے لیے فقط لوگوں کی اکثریت کا حوالہ دیا جائے اور ساتھ میں کوئی اور معیار یا دلیل نہ ہو۔

البتہ سند کے معاملے میں یہ ضرور دیکھ لینا کہ سند معتبر ہو۔ کسی فن کار کو ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہنا کر تصویر نہ کھنچوائی گئی ہو۔ بلکہ اگر اصلی ڈاکٹر یا حکیم بھی ہو، تو بھی معلوم کرنا کہ اسے تنخواہ کہاں سے ملتی ہے، اسے اسپانسر کون کرتا ہے۔ کہیں وہ کسی اور کی زبان تو نہیں بول رہا ہے۔

خیر، میاں جی، یہ تو پہلی مثال تھی۔ ووٹ کے معاملے میں بھی تم دروازے پر آنے والے سے اس طرح کے تنقیدی سوالات پوچھ سکتے ہو۔

دعویٰ: آپ فلاں شخص کو ووٹ دیں۔

دلیل: کیوں کہ دوسرے سب اسے ہی ووٹ دے رہے ہیں۔

سو تم سوال کرسکتے ہو کہ اسے کیسے پتا چلا کہ محلّے میں دوسرے سب اسی شخص کو ووٹ دے رہے ہیں؟ دروازے پر آنے والے نے کتنے افراد سے پوچھا؟ کتنوں کو گنا؟ کتنوں کو تولا؟

ممکن ہے اس نے صرف دو چار افراد سے بات کی ہو اور یہ سمجھ بیٹھا ہو کہ دوسرے سب اسی شخص کو ووٹ دے رہے ہیں۔ یعنی ممکن ہے دروازے پر آنے والا خود غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے وہ سراسر جھوٹ بول رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے وہ سچ بول رہا ہو اور واقعی پورا محلّہ ایک ہی شخص کو ووٹ دے رہا ہو۔

لیکن تم چاہو تو یہاں بھی اپنے سوال کا آغاز اس دلیل کے پنہاں پہلو سے کرو۔ مثلاً کیا یہاں بھی اکثریت کو معیار یا سند کے طور پر لیا جا رہا ہے؟

دعویٰ: آپ فلاں شخص کو ووٹ دیں۔

دلیل: کیوں کہ دوسرے سب اسے ہی ووٹ دے رہے ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور دوسرے سب اسے ہی ووٹ دے رہے ہیں تو انتخاب درست ہی ہوگا۔

لیکن بنیادی سوال وہی ہے۔ اگر پوری برادری، پورا محلّہ، پورا شہر بھی ایک شخص کو ووٹ دے رہا ہو، پھر بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص واقعی حق پر ہو۔ یعنی ضروری تو نہیں لوگوں کی اکثریت ہمیشہ درست انتخاب کرے۔ لوگ تو دیکھا دیکھی میں بھی ووٹ دے رہے ہوتے ہیں۔ کوتاہ نظری اور خودغرضانہ مفادات کی بنا پر بھی ووٹ دے رہے ہوتے ہیں۔ لیکن اصل معیار تو سچائی، قابلیت، کردار، بصیرت، اور معاملہ فہمی وغیرہ کو ہونا چاہیے۔

ہاں دوسرے لوگوں کی بات کو ضرور سننا چاہیے اور ان سے پوچھنا چاہیے کہ ان کے پاس کسی شخص کی اہلیت کے ضمن میں کیا دلائل ہیں۔ خاص طور پر ان لوگوں سے بھی مشورہ کیا جانا چاہیے جو خود صاحبانِ بصیرت ہوں، معاشرے اور تاریخ پر گہری نگاہ رکھتے ہوں، اور عملی میدان کا تجربہ بھی رکھتے ہوں۔

اور صرف دوسرے پر تکیہ کیوں کیا جائے۔ انسان کو اپنی سوچ، اپنے انتخاب کی ذمّہ داری لینی چاہیے۔ خود بھی تنقیدی تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیے۔ یہ دیکھے کہ جو بھی الیکشن میں کھڑا ہوا ہے اس کی کیا قابلیت ہے، کیا وژن ہے، کیا دعوے ہیں، کیا وعدے ہیں، کیا ماضی ہے، کیا حال ہے، اور کیا عملی اقدام ہیں۔ اور اگر دوسرے بھی یہی نعرے لگا رہے ہیں، تو فرق کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ویسے میاں جی، کہیں تم ریڈیکل سوچ رکھنے والے تو نہیں ہو؟ کبھی تمہیں ووٹ ڈالنے جاتے نہیں دیکھا۔ ہاں ویسے تمہیں کبھی تیل استعمال کرتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن پھر بھی، کہیں ایسا تو نہیں تم سوچتے ہو کہ یہ ووٹنگ پر مبنی نظام بھی تو اکثریت کو معیار بناتا ہے؟ یا یہ نظام دھرے بندی اور وقتی مفادات کی سیاست کو تقویت دیتا ہے؟ یا تم سوچتے ہو کہ صرف ووٹ ڈالنے سے کچھ نہیں بدلتا، بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے، پورے سسٹم کو بدلنے کی ضرورت ہے، پورے معاشرے میں انقلاب لانے کی ضرورت ہے؟

لیکن میاں جی، پھر مصلحت کے تقاضوں کا کیا کریں؟ انقلاب کے انتظار میں کیا میدان کو خالی چھوڑ دیں---؟

ہاں مگر مصلحت میں پڑ کر کہیں انقلابی طرز فکر کو نہ بھلا بیٹھیں---؟

خیر، بحث کہیں اور نہ نکل جائے، اس موضوع کو حاشیے میں ڈالتے ہیں۔ اگلی دلیل پر بات کریں---؟

لیکن میاں جی اب گیہوں چگنے کے بجائے گرد و پیش کے ماحول کا جائزہ لینے میں دلچسپی لے رہے تھے۔

محسن صاحب میاں جی کو کچھ لمحے دیکھتے رہے، پھر کہنے لگے۔

(ب) نیچر میں یوں ہی ہوتا ہے

ہاں میاں جی، ایک اور دلیل جو تم نے شاید اکثر سُنی ہو وہ کسی دعوے کے اثبات میں نیچر یا قدرتی ماحول کا حوالہ دینا ہے۔ کہ نیچر میں یوں ہی ہوتا ہے، اس لیے انسانوں کے لیے بھی وہ بات جائز ہے۔ بلکہ پسند کی گئی ہے۔

مثلاً کوئی کہے کہ شہد کی مکھیوں کو دیکھو۔ کیسے اپنی رانی کے گرد حلقہ ڈالے ہوتی ہیں۔ ایک نظام کے تحت چلتی ہیں۔ جیسا حکم دیا جاتا ہے ویسا ہی عمل کرتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں بھی یہی ہونا چاہیے۔ انسانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے حکمرانوں کی بلا چوں چرا اطاعت کریں۔

دعویٰ: انسانوں کو اپنے حکمرانوں کی بلا چوں چرا اطاعت کرنی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ شہد کی مکھیاں اپنی رانی کی اسی طرح اطاعت کرتی ہیں۔

میاں جی، یہاں سوچنے کی بات ہے کہ اگر شہد کی مکھیاں واقعی اپنی رانی کی بلا چوں چرا اطاعت بھی کرتی ہوں، صرف ان کا حوالہ دینا کیسے کافی ہوسکتا ہے۔ شہد کی مکھیاں کہاں اور انسان کہاں۔ یا پھر یہاں کوئی پنہاں دلیل ہے جو مقدّمے یا کلیّہ کا کام کر رہی ہے لیکن براہ راست بیان نہیں کی گئی ہے؟

آؤ کچھ امکانات پر غور کرتے ہیں:

(ا) سند:

میاں جی، ایک امکان سند ہے۔ یعنی کیا ممکن ہے نیچر کو یہاں سند کے طور پر لیا جا رہا ہو اور اوپر دیے گئے استدلال میں پنہاں دلیل اس طرح ہو:

دعویٰ: انسانوں کو اپنے حکمرانوں کی بلاچوں چرا اطاعت کرنی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ شہد کی مکھیاں اپنی رانی کی اسی طرح اطاعت کرتی ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور جو بات نیچر میں ہوتی ہے ہمیں اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

ہاں ایک طرح سے یہ کلیّہ درست ہے۔ کیوں کہ ہم انسان بھی نیچر کا حصہ ہیں اور نیچر کے بہت سے قوانین ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم بھی دن اور رات کے رِدھم کے ساتھ سوتے اور جاگتے ہیں۔ یا ہمیں کم و بیش اسی طرح سونا جاگنا چاہیے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو ہم میں اور نیچر کی دوسری مخلوقات میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ لیکن بہت سی متفاوت باتیں بھی ہیں۔ مثلاً ہم عقل اور ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمارے اپنے اخلاقی معیار ہیں۔ نیچر میں جس طرح دوسری مخلوقات زندگی بسر کرتی ہیں وہ ہمیشہ ہمارے لیے معیار نہیں ہوسکتا۔ البتہ شہد کی مکھی بھی ایک طرح سے ذہانت اور ارادہ رکھتی ہے، لیکن فرق بہرحال موجود ہے۔

(۲) مثال:

میاں جی، ایک دوسرا امکان مثال ہے۔ کیا ممکن ہے یہاں پنہاں دلیل اس طرح ہو:

دعویٰ: انسانوں کو اپنے حکمرانوں کی بلاچوں چرا اطاعت کرنی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ شہد کی مکھیاں اپنی رانی کی اسی طرح اطاعت کرتی ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور دوسری مخلوقات یہ کام کر رہی ہے تو ہمیں بھی یہی کام کرنا چاہیے۔ (یا ہمارے لیے بھی یہی کام درست ہے۔)

لیکن پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ کیا ضروری ہے ہم بھی وہی کام کریں جو دوسری مخلوقات کر رہی ہیں۔ ہمارے اپنے بھی کوئی اخلاقی معیار ہیں کہ نہیں۔

(۳) تشبیہ:

البتہ ممکن ہے یہاں مثال نہیں تشبیہ استعمال کی جا رہی ہو اور پنہاں دلیل اس طرح ہو:

دعویٰ: انسانوں کو اپنے حکمرانوں کی بلا چوں چرا اطاعت کرنی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ شہد کی مکھیاں اپنی رانی کی اسی طرح اطاعت کرتی ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتّا ہوتا ہے ویسا ہی انسانی معاشرہ ہوتا ہے۔

لیکن کیا واقعی دونوں ایک جیسے ہوتے ہیں؟ کیا عقل و ارادہ اور اخلاقی معیار ہمارے انسانی معاشروں کو خاصا مختلف نہیں بنا دیتے؟ چنانچہ یہ تشبیہ کس حد تک درست ہے؟

ویسے میاں جی، ہم نے دلیلِ تشبیہ کو اس سے قبل متعارف نہیں کرایا تھا۔ یہ بھی دلیلوں کی ایک قسم ہے اور کچھ کچھ دلیلِ مثال سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن دونوں میں فرق ہے۔ تشبیہ کو یوں سمجھو۔ تشبیہ یعنی ایک چیز کو کسی صفت میں دوسری چیز سے ملانا یا اس کے مانند ٹھہرانا۔ مثلاً کسی شخص کے بارے میں کہا جائے کہ 'وہ شیر **جیسا** انسان ہے'۔ یا یہی جملہ لفظ 'جیسا' کے بغیر کہا جائے۔ ظاہر ہے یہ محض تشبیہ ہے اور مثلاً صرف بہادری کی نسبت سے شیر اور انسان کو ملایا جا رہا ہے۔ ورنہ شیر تو جنگلی جانور ہے۔ اس کے طور طریقے اور اخلاقی معیار الگ ہیں، انسانوں کے الگ۔

(۴) عِلّت:

میاں جی، کیا ممکن ہے یہاں علّت کی دلیل دی جا رہی ہو۔ یعنی ایک عمل کو کسی اثر یا نتیجے سے جوڑا جا رہا ہو اور اوپر دیے گئے استدلال میں پنہاں دلیل اس طرح ہو:

دعویٰ: انسانوں کو اپنے حکمرانوں کی بلا چوں چرا اطاعت کرنی چاہیے۔

دلیل: کیوں کہ شہد کی مکھیاں اپنی رانی کی اسی طرح اطاعت کرتی ہیں۔

دلیل (مقدّمہ یا کلیّہ): اور بلا چوں چرا اطاعت کرنے سے شہد کی مکھیوں کا چھتّا کامیابی سے چلتا ہے۔

لیکن یہاں پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ جو کام مکھیوں کے چھتّے کے لیے کارگر اور مفید ہو، ضروری تو نہیں انسانی معاشرے کے لیے بھی ایسا ہی ہو۔

البتہ میاں جی، ممکن ہے اوپر دیے گئے استدلال میں کوئی اور پنہاں دلیل بھی ہو جو مقدّمے یا کلیّہ کا کام کر رہی ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک سے زیادہ پنہاں دلیلیں مل کر سامنے آئیں۔ تحلیلی تجزیے میں ان سب کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ اور ہاں، ضروری نہیں کہ کسی استدلال میں مقدّمہ یا کلیّہ ہمیشہ پنہاں صورت میں ہو۔ ممکن ہے اسے براہ راست بیان کر دیا گیا ہو۔

خیر---

لیکن میاں جی، اس ساری بحث کا کیا یہ مطلب ہوا کہ ہم شہد کی مکھیوں سے کچھ نہیں سیکھ سکتے؟

محسن صاحب نے میاں جی کی جانب دیکھا۔ لیکن میاں جی تو آسمان کو گھور رہے تھے۔
محسن صاحب نے بھی ایک نظر آسمان کی جانب دیکھا، پھر کہنے لگے،

ہاں میاں جی، نیچر سے ہم بہت سی دانائی کی باتیں، استعارے، اور حکایتیں وغیرہ سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن نیچر کے حوالے سے دی گئی ہر سند، ہر مثال، ہر تشبیہ، ہر علّت ہمارے لیے ہمیشہ دلیل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ہر دلیل کو اپنے اخلاقی معیارات پر جانچنا ہوگا۔ دیکھنا ہوگا کہ نیچر سے کہاں سیکھنا ہے کہاں نہیں۔ جیسے وہ ضرب المثل والا 'جنگل کا قانون' بالفرض جنگل کے لیے موزوں بھی ہو، انسانی معاشروں کے اخلاقی معیار تو اس سے کہیں بلند ہونے چاہییے۔

ویسے میاں جی، کیا تم نے زہرا نگاہ کی وہ نظم سنی ہے، ع سنا ہے جنگلوں کا بھی کوئی دستور ہوتا ہے؟

ہاں کبھی ساتھ بیٹھ کر پڑھیں گے۔۔۔

ارے پروفیسر۔۔۔ آؤ آؤ، خوش آمدید!

سامنے دیوار سے پروفیسر بلّی صحن میں کودی تھی اور اب قدرے سر جھکائے، نپے تلے قدم بڑھاتے ہوئے محسن صاحب کی جانب آ رہی تھی۔ پروفیسر نے محسن صاحب کی بات کے جواب میں منہ سے مختصر لیکن انتہائی متوازن 'میاؤں' نکالی۔

پروفیسر بلّی دیوار سے دیوار پر چلتے ہوئے تین چار گھروں میں وزٹنگ فیکلٹی کے طور پر چکر لگاتی تھی جہاں ان کی من پسند غذاؤں کے ساتھ خاطر مدارات کی جاتی تھی۔

البتہ میاں جی کی پروفیسر بلّی کے ساتھ بالکل نہیں بنتی تھی۔ اس وقت بھی پروفیسر کی آمد پر ایسے بے رخی کے ساتھ انتباہی بانگ دی، جیسے انھیں جانتے ہی نہ ہوں۔ پھر وہ لاتعلقی سے گیہوں پر جھک گئے۔

آؤ آؤ پروفیسر! بڑے اچھے موقع پر آئی ہو۔ ہم دو دن سے منطقی دلائل اور مغالطوں پر بات کر رہے ہیں۔ تم تو ان سے واقف ہو گی۔

میاں جی کن اکھیوں سے محسن صاحب اور پروفیسر کو بات کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ پروفیسر بلّی اس دوران محسن صاحب کے پاؤں سے آ کر لپٹنے لگی تھی۔ میاں جی نے دیکھا تو وہ بھی محسن صاحب کی کرسی کے نزدیک آ گئے۔ البتہ نگاہیں نیچی رکھ کر لاتعلقی کا انداز باقی رکھا۔

پروفیسر، کل تمھارا ذکر بھی آیا تھا۔ اگر تم کسی بیمار کو کوئی اچھا مشورہ دو تو قبول کیا جانا چاہیے یا نہیں۔ خاص کر اگر وہ مشورہ ایک بلّی کی جانب سے ایک مرغے کو دیا جا رہا ہو۔ البتہ یہ علمی بحث تھی اور تمھاری نیت پر شک کرنا مقصود نہیں تھا۔ ہمیں امید ہے تم بحیثیت پروفیسر بُرا نہیں مانو گی؟

پروفیسر بلّی جو محسن صاحب کے پاؤں سے لپٹے جا رہی تھی انھوں نے اس بار قدرے زور سے 'میاؤں' کیا۔ محسن صاحب نے اسے پروفیسر کی جانب سے فراخدلانہ رضامندی کے طور پر لیا۔

البتہ میاں جی نجانے کس گہری سوچ میں تھے کہ پروفیسر بلّی کے اچانک میاؤں کرنے سے چونک گئے اور فوراً ایک ٹھونگ پروفیسر کے سر پر مار دیا۔

جواباً پروفیسر نے تیز آواز میں 'میاؤں' کیا اور اپنا پنجا اٹھا کر دکھایا۔ پروفیسر کے اس فوری ردعمل میں دھمکی کم تھی اور احتجاج زیادہ تھا۔ لیکن میاں جی ان باریکیوں کو خاطر میں لائے بغیر دوبارہ ٹھونگ مارنے کے لیے پَر تول رہے تھے۔

محسن صاحب نے دیکھا تو زور سے کہا، میاں جی!

میاں جی، محسن صاحب کی آواز سن کر ششدر رہ گئے۔ چہرے کا رخ ایک جانب کر کے محسن صاحب کو دیکھا اور منہ سے ایک باریک سی شکایتی آواز نکالی۔

محسن صاحب تو بس یہ چاہ رہے تھے کہ جھگڑا نہ بڑھے۔ ان کی نیت میاں جی کو ڈانٹنے کی نہ تھی۔

لیکن میاں جی نے ایک بار پھر اپنا منہ پھیر لیا تھا اور اب تیزی سے چلتے ہوئے صحن کی دیوار تک پہنچ گئے تھے۔ میاں جی نے اپنے پَر پھیلا کر انھیں زور سے جھٹکا اور دیوار کے اوپر پہنچ گئے۔ پھر کچھ آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے ایک اونچی سی بانگ دی۔ اور دیوار کی دوسری جانب کود گئے۔

پیچھے محسن صاحب افسوس سے سر ہلاتے رہ گئے۔

پروفیسر سے منطقی گفتگو

(منطقی مغالطے)

لو پروفیسر، نوشِ جان کرو!

محسن صاحب نے پروفیسر بلّی کے سامنے دودھ کی کٹوری رکھتے ہوئے کہا۔ پروفیسر بلّی نے جواباً ایک تشکر آمیز 'میاؤں' کیا اور کٹوری پر جھک گئی۔

محسن صاحب کے یہاں ہر تیسرے روز ایک جاننے والے کے یہاں سے گھر کی اپنی گائے کا خالص دودھ آتا تھا۔ پروفیسر بھی اسی حساب سے وزٹ کرتی تھی۔

سامنے فرش پر گیہوں کے دانے اسی طرح پڑے تھے۔ محسن صاحب نے ایک نظر صحن کی دیوار کی جانب دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے میاں جی دیوار کے اوپر نمودار ہوئے تھے۔ میاں جی کبھی کبھی صحن پر نظر ڈالتے، پھر جیسے آسمان کی جانب دیکھنے لگتے۔

محسن صاحب کو اندازہ تھا کہ آج جب تک پروفیسر یہاں ہے، میاں جی شاید ہی صحن میں واپس آئیں۔ البتہ میاں جی صحن میں ہونے والی پیش رفت سے غافل بھی نہیں ہیں۔

محسن صاحب کی تو خواہش تھی کچھ صلح صفائی ہوجائے۔ لیکن یہ ایک مشکل امر تھا، خاص طور پر جب پروفیسر کی اس طرح خاطر مدارات کی جارہی ہو۔

پھر بھی، بات چیت کرنے سے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ کچھ اور نہیں تو شاید فضا میں موجود تناؤ میں کچھ کمی آجائے۔ سو محسن صاحب ایک بار پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھے اور اپنی نوٹس والی کاپی کو گود میں رکھتے ہوئے پروفیسر سے مخاطب ہوئے۔ لیکن آواز اتنی بلند رکھی کہ میاں جی بھی سن سکیں۔

پروفیسر، ہم تمھاری آمد سے پہلے منطقی دلیلوں اور مغالطوں پر گفتگو کر رہے تھے۔ اس علمی محفل میں تمھاری موجودگی کا ایک بار پھر شکریہ! اور خاص طور پر شکریہ کہ تم نے مثالوں میں اپنا نام لیے جانے پر بُرا نہیں مانا!

اب جب کہ محفل کے شرکا ایک بار پھر جمع ہوگئے ہیں، کیا خیال ہے گفتگو کو آگے بڑھایا جائے---؟

پروفیسر بلّی جو کٹوری پر جھکی ہوئی تھی، انھوں نے سر اٹھا کر محسن صاحب کی جانب دیکھا۔ اپنی زبان کو منہ پر پھیرا اور جیسے چبانے کے انداز میں منہ کو دو بار ہلایا۔ پھر دوبارہ کٹوری پر جھک گئی۔ محسن صاحب نے اسے رضامندی کے اظہار کے طور پر لیا۔

محسن صاحب نے دوسرے جانب دیکھا تو میاں جی بھی صحن کی طرف دیکھ رہے تھے۔

لیکن محسن صاحب سے نظریں ملتے ہی وہ دیوار کی سیدھ میں دیکھنے لگے۔

محسن صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

مغالطے کا مغالطہ

ہاں تو پروفیسر، دلیلوں کی فہرست طویل ہے۔ البتہ ہماری توجہ اب تک مغالطوں کے حوالے سے رہی ہے۔ کیوں کہ مغالطوں کو پہچاننا تو بہت ضروری ہے۔ زندگی میں بارہا ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ مثلاً سامنے والا کچھ کہہ رہا ہوتا ہے اور ہم کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ سامنے والا اپنی سوچ میں ہوتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں گھور رہا ہے۔ سامنے والا اپنے دفاع میں ہاتھ اٹھاتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جارحیت دکھا رہا ہے۔ یعنی غلط فہمی بھی تو مغالطہ ہی ہے نا!

محسن صاحب نے یہ کہتے ہوئے ایک نظر میاں جی کی جانب ڈالی۔ لیکن میاں جی نے اپنا بیگانوں کا سا انداز قائم کر رکھا تھا۔

لیکن پروفیسر، اس بات سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں مغالطے کا مغالطہ نہ ہو رہا ہو۔ یعنی ہم سمجھ رہے ہوں کہ مغالطے میں پڑ گئے ہیں اور غلط نتیجہ اخذ کر لیا ہے، لیکن وہ نتیجہ اصل میں درست ہو۔ مثلاً سامنے والا واقعی جارحیت کا ارادہ رکھتا ہو۔ بات اچھی کہہ رہا ہو لیکن ارادے نیک نہ ہو۔ امن کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو لیکن پیچھے حملے کی تیاری پکڑ رہا ہو۔ لیکن پھر کہاں مغالطہ ہے اور کہاں مغالطے کا مغالطہ، کبھی کبھار یہ فیصلہ کرنا کتنا دشوار ہوجاتا ہے۔۔۔

ہاں کم از کم یہ کیا جا سکتا ہے کہ مغالطوں کی قسموں کو پہچاننے لگیں۔ اپنے سوچنے کے انداز پر بھی نظر رکھیں۔ سامنے والے کی بات کو بھی سمجھنے کے لیے سنیں، نہ کہ صرف جواب دینے کے لیے۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ منطقی تجزیہ اور تنقید محض نکتہ چینی نہ بن جائے۔ خود تنقید کے معنی بھی تو **نَقْد کرنا** سے ہیں، یعنی کھرا کھوٹا پہچاننا، جانچنا، کسوٹی پر پرکھنا، تصدیق کرنا، وغیرہ۔ منطقی تجزیے اور تنقید سے تو فکر میں بالیدگی آنی چاہیے۔ تفکر کے نئے دریچے کھلنے چاہیے۔ اس طرح کہ معاملات سلجھنے کی جانب جائیں نہ کہ محض الجھتے رہیں۔ کم از کم مخلصانہ کوشش کی جانی چاہیے۔

محسن صاحب نے یہ آخری جملے قدرے زور دے کر کہے۔ لیکن میاں جی تو اب وقفے وقفے سے مسلسل بانگ دیے جارہے تھے، جیسے وہ اب محسن صاحب کی گفتگو سے مکمل لاتعلق ہوگئے ہوں۔

محسن صاحب کچھ لحظے میاں جی کی جانب دیکھتے رہے۔ ابھی وہ کچھ کہنے جارہے تھے کہ اچانک ان کے چہرے پر پانی کا ایک قطرہ آ کر ٹپکا۔ پھر ایک اور قطرہ ٹپکا۔ اور بوندا باندی شروع ہوگئی۔

محسن صاحب کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ میاں جی کی بانگ پھر سے بارش کے ہونے کا پتا دے رہی تھی۔ یعنی میاں جی خیریت سے تھے!

پروفیسر اس وقت تک اپنی کٹوری سے دودھ ختم کر چکی تھی اور اب صحن میں موجود ایک سایہ دار جگہ میں پناہ لینے جا رہی تھی۔

سامنے پڑے گیہوں کو پانی لگ رہا تھا۔ محسن صاحب آگے بڑھے اور گیہوں کے گتّے کو کھینچ کر سائے میں لے آئے۔

عین اس وقت میاں جی صحن میں کودے اور اب سر اٹھائے اپنے ڈربے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں انھوں نے ایک نظر پروفیسر کی جانب دیکھا جو اب سائے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ پروفیسر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میاں جی ایک لحظے کو رکے، ایک زوردار بانگ دی، اور بے نیازی سے آگے بڑھ گئے۔

محسن صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔

پھر وہ سوچنے لگے کہ ان دو تین دنوں میں کئی ایک دلیلوں اور مغالطوں پر گفتگو ہوگئی۔ اور یہ بھی اچھا ہوا کہ مغالطے کے مغالطے کا بھی ذکر آ گیا۔ البتہ ان مغالطوں اور دلیلوں کے اور بھی پہلو ہیں جن پر بات ہوسکتی تھی۔ اور ان کی دیگر اقسام بھی ہیں جن کا ذکر ہو سکتا تھا۔ کبھی اور موقع ملا تو وہ اس گفتگو کو آگے بڑھائیں گے۔

محسن صاحب اپنی جگہ سے اٹھے، ایک نظر پروفیسر اور میاں جی پر ڈالی، پھر گھر کے اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

خلاصہ (محسن صاحب کے نئے نوٹس سے اقتباس)

۱) منطقی تجزیے کے لیے ایک بنیادی شرط اپنی سوچ پر نظر رکھنا ہے۔ ایک تم ہو اور ایک تمہاری سوچ ہے۔ اسی طرح ضروری ہے غور سے سنا جائے سامنے والا کیا کہہ رہا ہے۔

۲) منطق میں تحلیلی تجزیہ کرتے ہوئے کسی استدلال کے دعوے اور دلیل کو مشخص کیا جائے۔ اور دیکھا جائے کہ دلیل میں کتنا وزن ہے اور وہ کس حد تک دعوے سے مطابقت رکھتی ہے۔

استدلال = دعویٰ + دلیل

۳) دلیل کی چند قسمیں، علّت، مثال، تشبیہ، اور سند ہیں۔ البتہ دلیلیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ کسی کے لیے گیہوں کے چند دانے بھی دلیل ہو سکتے ہیں کہ وہ آپ کا کام کر دے۔ کسی کے لیے سامنے والے کا ماضی بھی دلیل ہو سکتا ہے کہ اس سے محتاط رہا جائے۔ کسی کے لیے پیار سے بولے گئے دو بول بھی اس کی 'ناں' کو 'ہاں' میں بدلنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔

۴) دلیلِ علّت میں خاص طور پر دیکھا جائے کہ جس عمل یا چیز کا تعلق اثر سے جوڑا گیا ہے وہ متعلقہ یا ریلے ونٹ ہے کہ نہیں، کہیں کوئی دوسرا عامل تو نہیں، یا ایک سے زیادہ عوامل تو نہیں۔ **دلیلِ مثال** کے ضمن میں خاص طور پر دیکھا جائے کہ کیا مثالیں متعلقہ ہیں، کتنی مثالیں دی گئی ہیں، اور کیا جوابی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ **دلیلِ تشبیہ** میں دیکھا جائے کہ تشبیہ میں کیا نسبت ہے، کس حد تک متعلقہ ہے، اور دیگر کیا

مشترکات اور مفترقات ہیں۔ **دلیلِ سند** میں خاص طور پر دیکھا جائے کہ سند معتبر ہے، متعلقہ ہے، اور صاحبِ سند قابل اعتماد ہے کہ نہیں۔

۵) تحلیلی تجزیے میں کسی دلیل کے پنہاں پہلوؤں کو بھی نظروں میں رکھا جائے اور بقدر ضرورت زیر بحث لایا جائے۔ یہ پنہاں پہلو ممکن ہے مقدّمہ یا کُلیّہ بن کر دلیل کو دعوے سے ملا رہا ہو۔ ایک دلیل میں کئی پنہاں پہلو ہوسکتے ہیں۔ البتہ ضروری نہیں وہ مقدّمہ یا کُلیّہ ہمیشہ پنہاں ہو۔ ممکن ہے اسے براہ راست بیان کر دیا گیا ہو۔

٦) جامع تحلیلی تجزیے میں دعویٰ اور دلیل کے ساتھ ساتھ تناظر اور دیگر مُضمرات کو بھی نظروں میں رکھا جائے اور بقدر ضرورت زیر بحث لایا جائے۔ مثلاً دیکھا جائے کہ استدلال کا سیاق و سباق کیا ہے، کون پیش کر رہا ہے، کیسے پیش کر رہا ہے، پیچھے نیت اور مفادات کیا ہو سکتے ہیں، بحث کو کس جانب لے جایا جا رہا ہے، اور اس کے اثرات کیا ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح انسان خود اپنی سوچ پر بھی نظر رکھے کہ وہ کس بنیاد پر کسی دلیل کو قبول یا رد کر رہا ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ کہیں مغالطے کا مغالطہ تو نہیں ہو رہا۔

جامع تحلیلی تجزیے میں استدلال = دعویٰ + دلیل + تناظر/ مضمرات

۷) اردو زبان میں لفظ 'دلیل' کو بعض اوقات لفظ 'استدلال' کی جگہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مثلاً یوں لکھا جا سکتا ہے:

دلیل = دعویٰ + بنیاد/ثبوت + تناظر/ مضمرات

۸) اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ منطقی تجزیہ اور تنقید محض نکتہ چینی نہ بن جائے۔ خود تنقید کے معنی بھی **نَقْد کرنا** سے ہیں، یعنی کھرا کھوٹا پہچاننا، جانچنا، کسوٹی پر

پرکھنا، تصدیق کرنا، وغیرہ۔ منطقی تجزیے اور تنقید سے تو فکر میں بالیدگی آنی چاہیے۔ تفکر کے نئے دریچے کھلنے چاہیے۔ اس طرح کہ معاملات سلجھنے کی جانب جائیں نہ کہ محض الجھتے رہیں۔ کم از کم مخلصانہ کوشش کی جانی چاہیے۔

سانپ سیڑھی

(دینیات کا ایک سبق)

(کسی فارم ہاؤس میں ایک نجی اسکول کا اسٹاف پکنک پر آیا ہوا ہے۔ دینیات کے دو اساتذہ، سر ثاقب اور سر جواد، ایک درخت کے سائے میں سانپ سیڑھی کا بورڈ گیم کھیل رہے ہیں۔)

سرثاقب: لیجیے سر، آپ کی باری! ویسے یہ سانپ سیڑھی بھی عجب ہے۔ سوچیں تو کتنا سادہ سا کھیل ہے۔ بس چھکّا چلاؤ اور آگے بڑھو، سانپ سے بچو اور سیڑھی پر چڑھو، یہاں تک کہ سَو کے خانے تک پہنچ جاؤ۔ بچپن سے یہی کھیلتے آئے ہیں لیکن پھر بھی کھیل میں مزا باقی ہے۔

سر جواد (اپنی باری چلتے ہوئے): جی، اور لوگ اسے اکیلے بھی کھیلنے لگتے ہیں!

سرثاقب: جی ہاں، جیسے بازی بھی خود اپنے ساتھ ہو اور جیت ہار بھی اپنے ہی لیے ہو!

سر جواد: واہ واہ، بازی بھی خود اپنے ساتھ ہو اور جیت ہار بھی اپنے ہی لیے ہو، کیا خوب کہا! ماشاء اللہ! ویسے اس کھیل کے پرانے نہ پڑنے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ہمیں کہیں اپنی زندگی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی ذرا سوچیں تو ہم میں سے ہر ایک کو اس دنیا سے گزرنا ہے۔ یہاں کی تلخیاں اور مٹھاس چکھنی ہیں۔ ہر سانس ہمیں اس سفر میں آگے کو دھکیلتی ہے۔ چاہیں بھی تو رکنا مُحال ہے۔ گویا یہ سفر ہمارے وجود پر لکھ دیا گیا ہے۔ اور شاید اسی وجودی سفر کی تمثیل اس کھیل میں جھلکتی ہے۔

سر ثاقب: وجودی سفر کی تمثیل --- کیا گہری بات ہے، سر! ویسے میں اس کھیل میں اتنی گہرائی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

سر جواد: جی اور آپ کو شاید یہ بات بھی دلچسپ لگے کہ سانپ سیڑھی تو بہت قدیم کھیل ہے۔ کئی مذہبی تہذیبوں میں مختلف شکلوں اور تصوّرات کے ساتھ ملتا ہے۔ بنیادی نکتہ کچھ اسی طرح ہے کہ زندگی سفر ہے اور آگے بڑھتے رہنا ہے۔ مگر پھر انسان کی نیت، اعمال، اور قسمت وغیرہ اسے اس سفر میں کبھی اوپر لے جاتے ہیں کبھی نیچے۔ اور یہ سلسلہ یوں جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ کوئی کوشش کر کے آخری خانے تک پہنچ جائے۔ یہ آخری خانہ گویا حقیقت تک پہنچ جانا ہے، انلائٹمنٹ[۸۷] کو پا لینا ہے، جو اس انسان کی نجات اور آزادی بن جاتا ہے۔

سر ثاقب: ھوں ں ں-- سر یہاں تو آزادی کا خاصا گہرا مفہوم ہے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ آزادی کا مطلب چوئس تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ چاہو تو سانپ چُن لو، چاہو تو سیڑھی چُن لو، بس چوئس ہی کل معیار ہے۔ جب کہ یہاں تو یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ جو کام کیا جا رہا ہے اس میں اچھائی بھی ہے یا نہیں! انسان اپنے مقام سے اوپر بھی اٹھ رہا ہے یا نہیں! یا کہیں نیچے تو نہیں گر رہا!

سر جواد: جی سر، اور اس کام کا دوسروں پر بھی کیا اثر پڑ رہا ہے، معاشرے پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔ کہیں کوئی دوسروں کے لیے سیڑھی بننے کے بجائے سانپ تو نہیں بن گیا ہے!

سر ثاقب: بالکل!

---

[۸۷] Enlightenment

سر جواد (کچھ سوچتے ہوئے): ویسے سر، مجھے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ آج کل کی چوئس کے نعروں کے پیچھے بھی اچھائی کے مختلف تصورات ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہی نجات، آزادی، اور انلائٹمنٹ جیسے مفاہیم وہاں بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ نگاہ اس مادی دنیا تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ یا جیسے اس دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے۔

جب کہ حکمت کی گہری نظر سے دیکھیں تو انسان کی حقیقت محض اس کا مادی بدن نہیں ہے اور زندگی کا سفر بدن کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یوں اس دنیا کا مفہوم اور اس میں زندگی اور کامیابی کے معیار بہت بدل جاتے ہیں۔ مثلاً کسی کے مرنے پر ہم ایک دوسرے کو یاد دلاتے ہیں کہ 'انا للہ و انا الیہ راجعون' (سورۃ البقرہ، ۱۵۶)۔ کہ ہمارے وجود کا مرکز اور ہماری منزل اس دنیا تک محدود نہیں۔ جب کوئی مر جاتا ہے تو ہم 'انتقال' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، یعنی وہ شخص در حقیقت مرا نہیں بلکہ اگلے جہاں منتقل ہوگیا ہے۔

یا مثلاً یہ بھی ملتا ہے کہ لوگ سوئے ہوئے ہیں، جب مریں گے تو آنکھیں کُھلیں گی۔ اور کچھ لوگ ہیں جو مرنے سے پہلے اسی جہاں میں بیدار ہو جاتے ہیں۔ ان کے خواب میں بھی دو عالم کی حقیقتیں کشف ہو رہی ہوتی ہیں۔

پھر ہمیں یہ تاکید کے ساتھ کہا گیا ہے کہ 'قد افلح من زکاھا و قد خاب من دساھا' (سورۃ الشمس، ۱۰ - ۹)۔ یعنی فلاح، نجات، کامیابی اس میں ہے کہ انسان کا نفس کتنا پاکیزہ ہے۔ کس حال میں اس دنیا میں ہے۔ اور کس حال میں اس دنیا سے جاتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا بنیادی معرکہ تو یہاں ہوتا ہے۔

سر ثاقب: سبحان اللہ! لیکن سر، ہم خود کو دوسری چیزوں میں الجھا لیتے ہیں۔ دولت، طاقت، اور شہرت کے پیچھے ایسے بھاگتے ہیں جیسے اس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ ان چیزوں کے

حصول کو اصل کامیابی سمجھنے لگتے ہیں۔ بلکہ اخروی کامیابی کی نشانی کے طور پر بھی لینے لگتے ہیں!

سر جواد: جی بالکل! بھلا یہ چیزیں اخروی کامیابی کا معیار کیسے بن سکتی ہیں۔ وہ کہا جاتا ہے نا سب اس دنیا میں رہ جائے گا، صرف انسان کے اعمال قبر میں ساتھ جائیں گے۔۔۔ البتہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اعمال محض بینک بیلنس کی طرح ساتھ نہیں جاتے، بلکہ ہمارا نفس ان کے اثرات کو خود پر نقش بھی کر لیتا ہے۔

سر ثاقب: اثرات کو خود پر نقش بھی کرلیتا ہے۔۔۔ واہ کیا گہرا نکتہ ہے!

سر جواد: جی سر، ایک تفسیر یہ بھی ہے نا۔ آپ تو عربی جانتے ہیں۔ سورہ الشمس کی اس آیت میں 'زکاھا' کو پاک کرنا اور نمو دینا، دونوں معنی میں سمجھا گیا ہے۔ گویا ہم بیج بھی ہیں اور باغبان بھی۔ آب و گِل سے بھی بنے ہیں لیکن روحِ جاوداں بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ دنیا ایک باغ کی طرح ہے جہاں نمو پانا ہے، کچھ بن کر آگے جانا ہے۔ شاید اسی کا امتحان ہے۔ شاید اسی لیے پابندیوں اور آزمائشوں سے گزرنا ہے۔ شاید اسی لیے قضا و قدر ہمیں ایک طرح سے اختیار کا حامل بناتی ہے۔ اچھائیوں کی جانب مائل ہوں گے تو یہ بیج پاک ہوگا، نمو پائے گا، اونچائی کی طرف جائے گا۔ برائیوں کی جانب مائل ہوں گے تو یہ بیج آلودہ ہوگا، مرجھا جائے گا، خاک میں دھنسا رہ جائے گا۔

سر ثاقب: سبحان اللہ! سبحان اللہ! سر، بظاہر یہ سادہ سا کھیل ہے لیکن غور کرنے لگیں تو دینیات کے کتنے گہرے مفہوم سمجھے جا سکتے ہیں!

سر جواد: جی بالکل! بلکہ آپ کو بازار میں 'اسلامی سانپ سیڑھی' کے نام سے بورڈ گیم بھی شاید مل جائیں! ہوسکتا ہے کہیں اس بورڈ گیم کو 'صراط' کا نام دیا گیا ہو، کہیں 'معاد' کا،

کہیں کچھ اور۔ کہیں سانپوں پر برائیوں کے نام لکھے ملیں اور سیڑھیوں پر اچھائیوں کے نام۔ کہیں برائی پھیلانے والوں سے دوستی بھی سانپ بن جائے اور اچھائی پھیلانے والوں سے دوستی سیڑھی۔ اور آخری خانے میں جنت، لقاء اللہ، یا اس طرح کا کوئی مقام لکھا ہو۔

سر ثاقب: سبحان اللہ! یہ بہت ہی دلچسپ ہے!

سر ثاقب (کچھ توقف کے بعد): سر، میں سوچ رہا ہوں کہ امتحان اور آزمائشوں کا سامنا ہے لیکن اصل زندگی میں ہمارے پاس چوئس کس حد تک ہوتی ہے۔ ہم اپنے تئیں چھکّا تو چلا دیتے ہیں، لیکن آگے کیا نمبر آتا ہے، گوٹ کدھر پہنچتی ہے، یہ سب کہاں ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے چھکّے کو بھی زمانہ چلا رہا ہے اور ہم بس مُہرے ہیں۔

سر جواد: واہ سر، کیا فکر انگیز سوال ہے! آج آپ پورے موڈ میں ہیں! ویسے قابل غور بات ہے کہ کئی مذہبی تعلیمات میں اپنی زندگی کی ذمّہ داری لینے پر خاصا اصرار نظر آتا ہے۔ ہمارے یہاں تو خاص طور پر کہا جاتا ہے کہ ہر ایک کو اپنی قبر میں جانا ہے۔ ہر ایک سے سوال پوچھا جائے گا۔ اور یہ عذر اچھا نہیں کہ مجبور تھے یا کمزور بنا دیے گئے تھے۔

سر ثاقب: جی سر، لیکن کام ذرا مشکل نہیں؟ خاص طور پر آج کے دور میں جہاں قدم قدم پر سانپ ہی سانپ ہیں۔ بلکہ سیڑھیوں سے بھی سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا ہے۔ اور صرف اپنی غلطیوں کا نہیں، دوسروں کی غلطیوں کا بھی خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا ہر روز ایک پل صراط بنی ہوتی ہے اور ہم روز ہی لڑکھڑا کر نیچے گرتے ہیں۔ کبھی کبھی غالبؔ بڑی شدّت سے یاد آتا ہے کہ ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا!

سر جواد: جی سر، میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ میں خود بھی اس مسئلہ پر سوچتا رہا ہوں۔ یوں سمجھ میں آتا ہے جیسے ہم ایک طرح سے مختار بھی ہیں اور مجبور بھی۔ جیسے کوئی بچّہ اس دنیا میں آتا ہے تو اسے چلنا تو سیکھنا پڑتا ہے۔ یہ اس کے وجود پر لکھ دیا گیا ہے۔ وہ بار بار گرتا ہے، تکلیف سہتا ہے، لیکن ایک فطری لگن اسے متحرک رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے اور چلنا بھی سیکھ لیتا ہے۔ عموماً یہی دیکھا گیا ہے۔ میں نے اور آپ نے بھی بچپن میں اس مرحلے کو طے کیا ہے۔ لیکن ہم اپنی زندگی کے ہر مرحلے کو اتنے شوق سے طے نہیں کر پاتے اور زندگی واقعی پل صراط محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ زندگی کو تو ہمیں صرف چلنا نہیں پرواز کرنا بھی سکھانا تھا۔

پھر ذہن میں آتا ہے کہ اب اس دنیا میں آ ہی گئے ہیں تو پورے خلوص کے ساتھ کوشش کریں کہ اس سفر میں کچھ اچھا کر جائیں، اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔ اور دوسروں کے لیے سیڑھی نہیں بن سکتے تو کم از کم سانپ تو نہ بنیں۔ ہاں کوئی کسی دوسرے کے لیے اچھا کرنے جائے تو پہلے اُس سے بھی پوچھ لے! باقی خدا ہمارے حال سے بے خبر تو نہیں۔ وہ تو سمیع اور علیم ہے۔ رحمٰن اور رحیم ہے۔ اچھی امید رکھنی چاہیے۔ بس دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں ورنہ نہ وہ ہم سے دور ہے اور نہ اس نے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ غالبؔ نے بھی کہا تھا نا کہ ؏ کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے!

سر ثاقب: واہ واہ! کیا بات ہے!

سر جواد: ویسے سر، خاصی دیر ہوگئی ہے، آپ نے باری نہیں چلی!

سر ثاقب: اوہ ہاں!

سر ثاقب (باری چلتے ہوئے): ویسے سر میں سوچ رہا ہوں کہ سانپ سیڑھی کو ہمیں دینیات کے نصاب میں شامل کر دینا چاہیے۔

سر جواد: یوں، سانپ سیڑھی کھیلنے کو۔۔۔؟

سر ثاقب: نہیں نہیں، کھیل سے تو سب واقف ہیں۔ اور دینیات کی کلاس میں سانپ سیڑھی کھیلنے لگیں گے تو ایک شور مچ جائے گا۔ لیکن تمثیل کے طور پر، بات کو سمجھانے کے لیے۔ اس کے ذریعے زندگی کے بنیادی سوالات پر گفتگو کی جائے۔ یعنی ہم کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس دنیا میں کیا کر رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں، وغیرہ۔ دینیات کے تو یہ بنیادی سوالات ہیں۔ ان کے بغیر دینیات کا نصاب کہاں مکمل ہوسکتا ہے۔ سانپ سیڑھی پر بات کریں گے تو ہمارے اپنے عقائد کی گہرائیاں سامنے آئیں گی۔ آزادی کا بھی گہرا مفہوم سمجھ میں آئے گا۔ دوسرے مذاہب سے بھی آشنائی ہوگی اور شاید کچھ غلط فہمیاں بھی دور ہوجائیں۔ کم از کم یہی سمجھ میں آ جائے کہ یہاں ہر ایک کو وجودی سفر درپیش ہے۔ ہر کوئی مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ اور ایک انسان دوسروں کے لیے سیڑھی نہیں بن سکتا تو کم از کم سانپ تو نہ بنے۔

سر جواد: ھم م م۔۔۔ آپ کی بات میں وزن ہے۔ ہاں کھیل ذرا سادہ سا ہے۔ کیونکہ دنیا میں سانپ یا سیڑھی، صرف دو طرح کی سچویشن تو نہیں ہوتیں۔ یہاں تو طرح طرح کے کردار اور سچویشن سامنے آتی ہیں۔ اور سانپ سیڑھی کا معرکہ صرف ہمارے باہر نہیں، ہمارے اندر بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہوتا ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنے امتحان کا سامنا ہے۔ ہر ایک کی اپنی کہانی لکھی جاتی ہے۔ اور پھر سانپ بھی تو کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ البتہ ہمارے ماحول میں اسے نصاب میں ڈالنا ذرا مشکل کام ہے۔ میرا خیال ہے ایک اعتراض یہ بھی ہوگا کہ کہیں دینیات کا مضمون محض تصوّرات کی بحث

بن کر نہ رہ جائے۔ یعنی کہیں ایسا نہ ہو، جیسا کہ کہا جاتا ہے، انگلی چاند کی جانب اشارہ کر رہی ہو لیکن لوگ چاند کو دیکھنے کے بجائے انگلی کی بحث میں گم ہوجائیں۔ جو حقیقت کو پانا تھا، آخری خانے تک پہنچنا تھا، وہ مقصد نظروں سے اوجھل ہوجائے۔

سر ثاقب: جی سر، ہم ان تمام باریکیوں کو سامنے رکھتے ہوئے بات کو پیش کریں گے۔ کوشش تو کر سکتے ہیں!

سر جواد: جی سر، کوشش تو کرسکتے ہیں۔ چھکّا چلا کر دیکھتے ہیں۔ باقی نتیجہ ہمیشہ ہمارے ہاتھ میں کہاں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ ہماری سوچ سو فیصد درست ہو۔ ہاں پیار سے بات کریں گے تو ممکن ہے جو سانپ نظر آ رہا ہے وہ سیڑھی بن جائے!

گورکھ دھندا

(تفہیم کے زاویے)

'اے پروفیسر بابا! کوئی نصیحت، کوئی حکایت، کوئی تو کلید بیان ہو! گھنٹوں اس پہاڑی پر سرگرداں رہے، تب یہاں پہنچے۔ بابا، خالی ہاتھ تو نہ لوٹاؤ!' ہم میں سے ایک نے التجا بھری آواز میں کہا۔ وہ یونیورسٹی میں ہم سب سے سینیر تھا۔

پروفیسر بابا دیر سے سر جھکائے ایک سپاٹ سے پتھر پر چار زانو بیٹھے ہوئے تھے۔ آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔

اچانک انھوں نے آنکھیں کھولیں اور ہمارے سینیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

'کیا وہ قول نہیں سنا کہ نصیحتیں بکھری پڑی ہیں، حاصل کرنے والے کم ہیں۔'

'سچ کہا، پروفیسر بابا۔ سچ کہا!' ہمارے سینیر نے کہا۔

'پس یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟'

'لیکن پروفیسر بابا، کسی کلید، کسی روش کی نشاندھی تو ہو!' دوبارہ اسی سینیر نے پُر درد آواز میں کہا، 'آنکھ دیکھتی ہے، لیکن دکھائی نہیں دیتا، کان سنتا ہے، لیکن سنائی نہیں دیتا، دل ڈھونڈتا ہے، لیکن عبرت نہیں پکڑتا!'

پروفیسر بابا نے ایک نظر ہمارے سینیر کو غور سے دیکھا، پھر کہا،

'کیا ہم سبھی ایسی کلید کی تلاش میں نہیں!'

پروفیسر بابا نے یہ کہہ کر دوبارہ سر جھکا لیا۔ ہم بھی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔

ہم سب یونیورسٹی میں سوشل سائنسز اور ہیومینٹیز سے متعلقہ شعبوں میں پڑھتے تھے۔ دل میں نوجوانی کا ولولہ تھا، انسانیت کے لیے کچھ کر گزرنے کی تمنّا تھی۔ ایک علمی و ادبی حلقہ بھی بنا رکھا تھا جس میں نصابی و غیر نصابی کتابوں پر مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن ہم اپنے کام سے مطمئن نہیں تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہماری فہم، ہماری گفتگو سطحی تھی۔ نہ اپنے تجزیے میں کوئی گہرائی محسوس ہوتی تھی اور نہ معاشرے میں بامعنی تبدیلی کے لیے کوئی سنجیدہ لائحہ عمل سُجھائی دیتا تھا۔ جیسے کوئی قفل پڑا تھا اور کلید پاس نہیں تھی۔

اور اب اسی کیفیت میں پروفیسر بابا کی خدمت میں آ پہنچے تھے اور ان سے اپنا مسئلہ بیان کیا تھا۔ پروفیسر بابا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ہمارے سینیر نے بس اتنا بتایا تھا کہ کسی زمانے میں یونیورسٹی میں پروفیسر ہوا کرتے تھے۔ سال میں کچھ دن اس پہاڑی پر خلوت میں بسر کرتے تھے۔ باقی سارا سال کہاں ہوتے تھے، معلوم نہ تھا۔ ہم کچھ شرمندگی بھی محسوس کر رہے تھے کہ ایسے ہی منہ اٹھائے چلے آئے تھے اور ان کی خلوت میں مُخل ہو رہے تھے۔

پروفیسر بابا نے کچھ لمحوں کے بعد سر اٹھایا اور کہنے لگے،

'ہم سب اس جہاں میں مسافر ہیں اور یہ جہاں ایک گورَکھ دَھندا ہے۔ اب تک اتنا سمجھ میں آیا ہے کہ دل میں درد و سوز زندہ رہے تو اچھا ہے ورنہ اس گورَکھ دھندے میں کھو جانا بہت آسان ہے۔'

'پروفیسر بابا، یہ گورَکھ دَھندا کیا ہے؟' ہم میں سے ایک نے سوال کیا۔

پروفیسر بابا نے اُس کی جانب دیکھا۔ پھر ایک نظر ہم سب کو دیکھا۔ کچھ دیر سر جھکائے خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے، 'تم لوگوں نے اس کبوتر بچّے کا قصّہ سنا ہے جس کی تاک میں ایک بوڑھا عقاب تھا؟'

'نہیں پروفیسر بابا!' ہمارے منہ سے نکلا۔ ہم خوش ہوگئے کہ پروفیسر بابا اب تفصیل میں جا رہے تھے۔

'اچھا تو غور سے سنو!' پروفیسر بابا کی نظریں اپنے سامنے زمین کی جانب تھیں۔

'کبوتر بچّے نے اپنی تاک میں ایک بوڑھے عُقاب کو دیکھا تو پوری جان لگا کر اُڑا۔ لیکن پہاڑ سے جنگل کی جانب اور جنگل سے واپس پہاڑ کی جانب، وہ جہاں جاتا، بوڑھا عقاب بھی پیچھے پہنچ جاتا۔ آخر وہ ایک درخت کی شاخ پر آ بیٹھا اور پتّوں کے نیچے چُھپنے لگا۔ لیکن اوپر دیکھا تو بوڑھا عقاب اسی درخت پر منڈلا رہا تھا۔ اور نیچے دیکھا تو ایک شکاری کمان میں تیر لگائے اُس کا نشانہ لے رہا تھا۔ اب نہ پرواز میں عافیت تھی نہ بیٹھے رہے میں امان۔ کبوتر بچّہ ہمت ہار بیٹھا اور آنکھیں بند کرنے لگا۔ اس کے دل سے ایک آہ نکلی۔ اچانک اس شکاری کو ایک سانپ نے ڈس لیا۔ شکاری کا نشانہ چوک گیا اور تیر نیچے جھپٹتے ہوئے بوڑھے عقاب کو جا لگا۔ شکاری اور بوڑھا عقاب دونوں زمین پر آ گرے اور کبوتر بچّہ بخیر و عافیت وہاں سے اُڑ گیا۔'

پروفیسر بابا یہ کہہ کر خاموش ہوگئے، سر جھکا لیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔

'سچ کہا پروفیسر بابا، سچ کہا!' ہمارے سینیر نے کہا۔

پروفیسر بابا اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ خاصی دیر ہوگئی۔ ہمارے ذہن میں پروفیسر بابا کی بیان کردہ حکایت کو سوچتے ہوئے کئی نکات آ رہے تھے۔ ہم خیال کر رہے تھے کہ شاید یہی نکات مقصود تھے اور اب چلنا چاہیے۔ لیکن ہمارا سینیر بیٹھا رہا، سو ہم بھی بیٹھے رہے۔

اچانک پروفیسر بابا نے آنکھیں کھولیں، ہم سب پر ایک نظر دوڑائی، پھر دوبارہ اپنے سامنے زمین کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگے،

'غور سے سنو! عقاب بوڑھا ہوچکا تھا۔ اس کی مادہ بھی اسی کی طرح بوڑھی تھی اور اسے نظر بھی نہیں آتا تھا۔ پورا وقت غار کے دہانے پر بیٹھی رہتی تھی۔ تین دن سے دونوں بھوکے تھے۔ تین دن سے بوڑھا عقاب شکار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اتنے میں اسے ایک کبوتر بچہ پہاڑ کے پاس آوارہ گھومتا نظر آیا۔ عقاب کی امید بندھ گئ۔ اس نے زور لگایا اور کبوتر بچّے کی جانب لپکا۔ لیکن کبوتر بچہ پھرتیلا نکلا اور اس کے چنگل میں نہ آیا۔ عقاب کبوتر بچّے کے تعاقب میں لگا رہا۔ آخر اس نے کبوتر بچّے کو ایک درخت پر پتوں کے درمیان چھپا دیکھا۔ عقاب نے اپنی رہی سہی ہمت جمع کی۔ لیکن ابھی وہ جھپٹا ہی تھا کہ کہیں سے ایک تیر آ کر اس کے بدن میں پیوست ہوگیا۔ بوڑھا عقاب تڑاق سے زمین پر آ گرا۔ کچھ ہی لمحوں میں اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اس رات اس کی مادہ دیر تک راہ تکتی رہی۔ پھر اس نے بھی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔'

پروفیسر بابا یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔

'سچ کہا پروفیسر بابا، سچ کہا!' ہم سب ایک ساتھ بولے۔ ذہن میں مختلف سوچیں آ رہی تھیں۔

پروفیسر بابا نے دوبارہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ لیکن ہم وہاں سے نہیں ہٹے۔ انتظار کرتے رہے۔

پروفیسر بابا نے کچھ لمحوں بعد پھر آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے،

'یہ بھی غور سے سنو! شکاری اور اس کا لڑکا حاکم کے زندان میں قید تھے۔ حاکم کو ایک عجیب بیماری آ لگی۔ طبیب نے مشورہ دیا کہ جنگلی کبوتر کے بچّے کا گوشت کھائے۔ حاکم نے شکاری کو بلایا اور کہا اگر شام تک ایک جنگلی کبوتر کے بچّے کو لے آیا تو دونوں کو آزاد کر دیا جائے گا اور اگر نہ لاسکا تو لڑکے کا سر تن سے جدا کر دیا جائے گا۔ شکاری دن بھر

جنگل میں بھٹکتا رہا لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اب شام ہونے کو تھی۔ شکاری کو اپنے لڑکے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اچانک اسے ایک کبوتر کا بچّہ شاخ پر بیٹھا دکھائی دیا۔ شکاری کی امید بندھ گئی۔ وہ نشانہ لے کر تیر چھوڑنے ہی لگا تھا کہ پاؤں پر ایک سانپ نے ڈس لیا۔ زہر مہلک تھا۔ شکاری دھپ سے وہیں زمین پر گر گیا۔ ایک آخری بار اس کے لبوں پر اپنے لڑکے کا نام آیا۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔'

پروفیسر بابا یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔

'سچ کہا، پروفیسر بابا۔ سچ کہا!' ہم سب نے مل کر کہا۔ ہم وہیں بیٹھے رہے۔ امید کر رہے تھے اب سانپ کی زاویے سے بھی اس حکایت کو سنیں گے۔

لیکن پروفیسر بابا نے مزید کچھ نہیں کہا۔ بس آنکھیں بند کیے بیٹھے رہے۔ خاصا وقت گزر گیا۔ اب شام ہو گئی تھی۔

'پروفیسر بابا، اس حکایت میں سانپ بھی ہے؟' ہم میں سے ایک نے کہا۔

پروفیسر بابا نے آنکھیں کھولیں اور جیسے کچھ سوچتے ہوئے، کچھ سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے، 'ہاں--- سانپ بھی ہے، شکاری کا لڑکا بھی، حاکم بھی، طبیب بھی، اور بھی کئی کردار ہیں۔'

'بابا، پھر ان میں کس سے نصیحت حاصل کریں؟' ہمارے سینیر نے پوچھا۔

'نصیحت تو ہر زاویے میں ہے۔ اس جہاں کے کونے کونے میں ہے۔' پروفیسر بابا نے نظریں جھکائے ہوئے اور سر ہلاتے ہوئے یوں کہا جیسے اپنے آپ سے گفتگو کر رہے ہوں۔

'ہاں مگر مت بھلانا کہ یہ جہاں ایک خواب کی طرح ہے جس میں عبرت بھی لینی ہے اور جس سے بیدار بھی ہونا ہے۔'

'بس دل کو نظر چاہیے، باہر کا جہاں دیکھنے کے لیے بھی اور اپنے اندر کے جہاں میں جھانکنے کے لیے بھی۔ کہ وہ کبوتر بچّہ، عقاب، شکاری، سانپ، حاکم، طبیب، سب باہر بھی ہیں اور اندر بھی۔ لیکن کوئی دیکھ کر اپنے لیے نصیحت حاصل کرتا ہے، کوئی توجیہ گھڑتا ہے، کوئی بہانے تراشتا ہے، اور کسی کی عقل کو یہ گورکھ دھندا ماؤف کر دیتا ہے۔'

'اور یہ بھی جان لو کہ دل کی نظریں کئی ہیں۔ موسیٰ کی نظر پر مواخذہ نہ بھی ہو، پھر بھی خضر کی نظر کے بغیر ادھوری ہے۔'

'مگر تلاش جاری رہے تو اچھا ہے۔ اِس گورکھ دھندے میں نہ جانے کون کہاں کسی کلید کو تلاش کر لے۔'

پروفیسر بابا یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔ آنکھیں پھر سے بند کر لیں۔

'بابا، کیا درد و سوز زندہ رہے تو دل کی آنکھیں بھی کُھل جاتی ہیں؟ کیا یہی وہ کلید ہے؟' ہمارے سینیر نے پوچھا۔

لیکن پروفیسر بابا نے کوئی جواب نہ دیا۔

'کیا تہذیبِ نفس میں وہ کلید ہے---؟' ہمارے سینیر نے پھر پوچھا۔

پروفیسر بابا نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔

'کیا اپنے وجودی فَقَر کا احساس کر لینے میں ہے---؟

کوئی جواب نہ ملا۔

'کیا علم کی ترویج میں ہے---؟' اس بار ہم میں سے ایک اور نے پوچھا۔

لیکن پروفیسر بابا بدستور خاموش رہے۔

'کیا انسانیت کی خدمت میں ہے---؟' ایک دوسرے نے پوچھا۔

خاموشی برقرار رہی۔

اندھیرا چھا رہا تھا۔ ہم نے مزید سوال پوچھنے کی کوشش کی، لیکن پروفیسر بابا اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔

بالآخر ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور پروفیسر بابا کو سلام کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے ہمارے ایک ساتھی نے کہا،

'میرا خیال ہے پروفیسر بابا اُس ہاتھی والی تمثیل کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔ وہی جس میں کسی بستی کے لوگوں نے پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا اور اب ایک اندھیرے کمرے میں ہاتھی کو چُھو کر اسے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جس نے پاؤں کو ہاتھ لگایا، اس کے نزدیک ہاتھی ستون کی طرح تھا۔ جس نے دُم کو ہاتھ لگایا، اس کے نزدیک سانپ کی طرح۔ جس نے کان کو ہاتھ لگایا، اس کے نزدیک سوکھے مشکیزے کی طرح، وغیرہ۔'

ایک دوسرے نے جواب میں کہا، 'لیکن وہاں یہ اَسمپشن تھی کہ ہاتھی کا وجود اپنی حقیقت رکھتا ہے جس پر ہمارے دیکھنے نہ دیکھنے سے فرق نہیں پڑتا۔ اور اصل مسئلہ ہماری رسائی اور محدودیت کا ہے۔ لیکن یہاں تو ہر زاویے کے ساتھ حقیقت بدل رہی ہے۔ اخلاقی معیار بدل رہے ہیں۔'

'نہ حقیقت بدل رہی ہے اور نہ اخلاقی معیار بدل رہے ہیں۔ فہم کے بڑھنے سے پوری تصویر دکھائی دینے لگتی ہے۔ معاملے کو اس کی پیچیدگیوں کے ساتھ سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔' ایک تیسرے ساتھی نے کہا۔

'جیسے خضر اور موسیٰ کی نظر والی بات جو بابا نے کی تھی!' ایک اور نے کہا۔

'لیکن کیا وہ دونوں علمِ لَدُنّی کے حامل نہیں تھے؟'

'ہاں، یوں تو معاملہ خاصا پیچیدہ ہو جاتا ہے۔'

'صرف پیچیدہ نہیں، گورَکھ دَھندا بن جاتا ہے، گورَکھ دَھندا!'

'میں سوچ رہا ہوں کہ جب یہ جہاں ایک خواب کی طرح ہے، تو پھر عبرت لینے کے کیا معنی ہیں؟ خواب تو خواب ہوتا ہے، پھر کیا حقیقت کیا وہم، کیا اچھا کیا برا، کیا حسن کیا قبح، ان بحثوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟

'نہیں لیکن انسان کا اپنا وجود تو اصلی ہے، روح تو حقیقت رکھتی ہے۔ بدن خاک میں مل جاتا ہے لیکن روح تو اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔'

'لیکن روح بھی تو ایک معمّا ہے!'

پہاڑی سے اترتے ہوئے ہم یہی بحث کرتے رہے۔ کسی نتیجے تک تو نہیں پہنچے لیکن ہم سب نے اپنی گفتگو میں گہرائی اور نئے سوالات کو واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

اُس دن کے بعد ہم کئی بار پروفیسر بابا کی تلاش میں اس پہاڑی پر گئے۔ لیکن وہ پھر نہیں ملے۔

اب اس بات کو ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن ایک ہی کہانی کو کئی زاویوں سے سمجھنے کا وہ سبق ہم سب کو بڑا راس آیا۔ گریجویشن کے بعد ہم میں سے ایک نے فیملی کاؤنسلنگ کے پیشے کو اختیار کر لیا۔ دو وکیل بن گئے۔ ایک نے پی-آر فرم کھول لی۔ ایک نیوز چینل پر ٹاک شو کا میزبان بن گیا۔ ایک ناول نگار بن گیا۔ اور ایک تنقید نگار بن گیا، جس کی حال ہی میں، تنقید کے کلاسیکی اور ماڈرن رجحانات، کے موضوع پر ایک کتاب بھی شائع ہوئی۔ خود میں نے اپنا ڈاکٹریٹ فلسفہِ اخلاق کے موضوع پر کیا اور اب ایک یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔

ہاں اور جو ہمارا سینیر تھا، وہ ہم سے پہلے گریجویٹ کر چکا تھا۔ پھر اس کی کوئی خبر نہیں آئی۔ لیکن امید ہے پروفیسر بابا کا وہ سبق اس کے لیے بھی مفید رہا ہوگا۔

(اوپر پیش کی گئی کبوتر بچّے سے متعلق پہلی کہانی فارسی ادب سے ماخوذ ہے۔)

پہلا باب - شہید مِلّت روڈ

(گل و بلبل والا افسانہ)

'او یارے--- او پیارے---!' سڑک سے ایک اونچی سی آواز آئی۔

بے ساختہ میری نگاہ اس جانب اٹھ گئی۔ ایک رکشے والا میرے چلنے کی رفتار سے رفتار ملاتا اپنا آٹو رکشا قریب لا رہا تھا۔ میں نے گرد و پیش پر ایک نظر ڈالی۔ سوچوں میں اتنا گم ہوگیا تھا کہ ہوش ہی نہ رہا اور چلتے چلتے شہید ملّت روڈ تک آ پہنچا تھا۔

'--- مگر پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں اب کہاں ہوں---'

'کہاں جاؤ گے، پیارے؟' اُس نے رکشا روک کر پوچھا۔

'کہیں نہیں، دوست۔' میرے لہجے میں کچھ بیزاری تھی۔ اس سے پہلے بھی دو رکشے نزدیک آئے تھے، مگر میں نے اشارے سے نہ کہہ دیا تھا۔ کراچی کے اس پرہجوم شاپنگ ایریا میں مسافروں کی کمی نہیں تھی سو وہ رکشے بھی بے نیازی سے آگے بڑھ گئے۔ مگر یہ تو رک ہی گیا تھا۔

'کہیں نہیں---؟' رکشے والا مسکراتے ہوئے بولا۔ 'پیارے، اسی طرح چلتے رہے تو کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جاؤ گے نا---!'

میں نے اب اسے ایک نظر غور سے دیکھا۔ گندمی رنگ دھوپ میں سلگا ہوا سا تھا۔ بھری جسامت، گول چہرہ تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں پھیلتی ہوئی چاندنی نمایاں تھی۔ آنکھوں میں چمک بالکل کسی چھوٹے بچے کی آنکھوں جیسی تھی۔ عمر میں مجھ سے دس، بارہ سال بڑا ہوگا، شاید چالیس، بیالیس برس کے قریب۔ مگر انداز کچھ مداخلانہ سا تھا۔

'نہیں، کہیں نہیں۔' میں نے دوبارہ کہا اور چہرے کا رخ موڑتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ سوچا میری بے اعتنائی دیکھ کر وہ خود ہی چلا جائے گا۔

آسمان کی گہری سرخی اب رات کی سیاہی میں ڈھل رہی تھی۔

'۔۔۔ میں کتنی دیر سے چل رہا ہوں۔۔۔'

نازو کے کیفے سے نکلنے کے بعد نجانے کتنی دیر گُم صُم بیٹھا رہا۔ وہ جو کچھ کہہ کر گئی تھی اس کے بعد ذہن جیسے ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر پھر ویٹر کچھ بے صبرے دکھائی دینے لگے۔ میں نے بل ادا کیا اور باہر آ گیا۔ باہر سندھی مسلم چورنگی کے نزدیک کھڑا تھا۔ میں نے رکشا نہیں لیا۔ گھر اس حالت میں نہیں جاسکتا تھا۔ خیالات، سوالات، احساسات سب امڈ امڈ کر آپس میں الجھ گئے تھے۔ مجھے پیدل چلنا تھا۔ پیدل چل کر ہی انھیں سلجھا سکتا تھا۔

سندھی مسلم چورنگی سے کئی سڑکیں اور گلیاں نکلتی ہیں۔ کچھ رہائشی بلاکس کی طرف جاتی ہیں۔ کچھ محض سنسان سی دکھائی دیتی ہیں۔ کسی سنسان گلی میں بس یونہی چلنا کراچی کے موجودہ حالات میں ذرا رِسکی ہوتا۔ رہائشی علاقہ ہو تو پھاٹکوں پر موجود محافظوں کی شکی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن ایک سڑک طارق روڈ کی طرف بھی جاتی ہے۔ طارق روڈ پر عموماً شام کے وقت خریداروں، دکانداروں، اور ٹھیلے والوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ جا بجا نجی سکیورٹی گارڈز اور اکا دکا پولیس اہلکار بھی نظر آجاتے ہیں۔ رش کی وجہ سے گاڑیاں بھی دھیمی رفتار سے چلنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس ہجوم میں میری اجنبیت بھی باقی رہتی اور تحفظ کا احساس بھی مل جاتا۔ سو میں اسی ہجوم کا حصہ بن کر، سر جھکائے، خیالات میں گم چلنے لگا۔

'۔۔۔ چلتے چلتے پون گھنٹہ تو ہوگیا ہوگا، شاید اس سے بھی زیادہ۔۔۔'

'۔۔۔ اندھیرا چھا رہا ہے، گھر چلنا چاہیے۔۔۔'

مجھے محسوس ہوا رکشا اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ میں نے رخ موڑ کر اس جانب دیکھا۔ رکشے والا اسی طرح مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔

'۔۔۔ شاید اسے بھی کہیں پہنچنے کی کوئی خاص فکر نہیں ہے۔۔۔'

'پی۔آئی۔بی کالونی چلو گے؟' میں نے پوچھا۔

'چلیں گے نہیں، دوڑیں گے!'

میرا فلیٹ شہید ملت روڈ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ راستہ بھی سیدھا سا تھا۔ رکشے والا درمیانی رفتار سے رکشا چلا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہینڈل پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔شانے دھیرے دھیرے لہک رہے تھے۔ شاید سمندر سے آتی شام کی ہوا سے محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ خاصی پیش بینی کے ساتھ سڑک کی ناہمواریوں اور گڑھوں سے بچتا بچاتا جا رہا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اس علاقے میں ایک عرصے سے رکشا چلا رہا ہے۔

شاید اس نے ایک دو بار اپنے عقب بیں آئینے سے میری طرف بھی دیکھا، لیکن میرا ذہن دوبارہ سوچوں میں کھو گیا تھا۔

نازو کی آنکھیں میرے سامنے تھیں، اُس کی گہری سیاہ آنکھیں۔۔۔ لیکن آج ان میں کیسی سرد مہری تھی۔ جیسے طے کر کے بیٹھی تھیں کہ ان میں نہ کوئی رنگ اترے گا نہ نمی تیرے گی۔ اور نازو کے الفاظ۔۔۔ جیسے کسی دشوار پُل عبور کر کے آئے تھے۔ کہ اب کوئی دلیل، کوئی سوال، بیتے دنوں کا کوئی حوالہ انھیں پلٹنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

'شہاب، میں سمجھتی تھی کہ لوو کونکرز آل[۸۸]---۔ مگر یہ سچ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ ہم دو الگ الگ راہوں کے مسافر ہیں۔'

وہ کہے جا رہی تھی اور میں حیران و پریشان اسے تک رہا تھا۔ '--- دو الگ الگ راہوں کے مسافر---؟'

'شہاب، آج کی دنیا آئیڈیلزم پر نہیں چلتی۔ انقلابی تبدیلی لانے کے خواب اب فرسودہ ہوگئے ہیں---'

'اب تم جیسے لوگ نادان اور سادہ لوح کہلاتے ہیں---'

'لیکن تم اپنے خوابوں اپنے اصولوں کے اسیر رہو گے۔ تم اس خول سے باہر نہیں نکل سکتے---'

'شہاب، میں ایک پریکٹیکل لڑکی ہوں۔ میں حقیقت کو حقیقت کی نظروں سے دیکھتی ہوں۔ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ زندگی میں کچھ بننا ہے---'

'شہاب، میں جانتی ہوں ہم ایک مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ لیکن یوں ہی بندھے رہے تو یہ زندگی کسی ایک کے لیے عمر قید بن کر رہ جائے گی---'

'سگریٹ؟'

میں چونک گیا۔ رکشے والے نے اپنا بایاں ہاتھ میری جانب پیچھے کیا ہوا تھا۔ ہاتھ میں سگریٹ کا ایک سیلڈ پیکٹ تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے عقب بیں آئینے سے میری جانب دیکھا، پھر سامنے دیکھنے لگا۔ اس کا دوسرا ہاتھ رکشے کے ہینڈل پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔

---

[۸۸] Love Conquers All

'نہیں شکریہ۔' میں نے کہا اور چہرے کا رخ باہر سڑک کی جانب کر لیا۔ ہم جیل چورنگی کے فلائی اوور کو عبور کر رہے تھے۔ ایسا کم ہی ہوتا ہوگا کہ رکشے والے مسافروں کو سگریٹ آفر کریں۔ یہ کچھ زیادہ ہی مہمان نواز لگ رہا تھا۔

'پیارے۔۔۔' اس نے پیکٹ کو مزید میری جانب بڑھایا۔ 'محبوبہ کی طرح یہ بھی دل، جگر، خون، سب جلاتی ہے!'

میں نے عقب بیں آئینے میں اسے گھور کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھے شک گزرا کہ اس نے میری اندرونی کیفیت کو بھانپ لیا ہے۔

'نہیں، میں سگریٹ نہیں پیتا۔' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے سگریٹ کے پیکٹ کو اپنی قمیض کے سامنے والی جیب میں ڈال دیا۔ میں رکشے سے باہر کی جانب دیکھنے لگا۔

'دل ٹوٹا ہے۔۔۔؟' اچانک اس نے کہا۔

'کیا مطلب؟' میرے منہ سے نکلا۔ کچھ زیادہ ہی بےتکلّفانہ سوال تھا۔

'مطلب یہ کہ محبوبہ چھوڑ گئی ہے، پیارے؟'

عجیب انسان تھا۔ میرا نارمل ردعمل تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ جواب نہ دیتا۔ مگر اس کے انداز میں ایک عجیب سی معصومیت اور دوستانہ پن تھا۔ کچھ میرا بھی جی چاہ رہا تھا کہ کسی سے بات کرکے اپنے دل کا بوجھ ذرا ہلکا کر لوں۔ پھر کروڑوں انسانوں کے اس شہر میں جہاں ہزاروں رکشے چلتے ہیں، اس اجنبی سے دوبارہ کہاں ملاقات ہونی تھی کہ سامنے کچھ اقرار کر لینے کے بعد پھر افسوس ہو۔

'کیسے کہہ سکتے ہو کہ دل ٹوٹا ہے یا کوئی محبوبہ چھوڑ گئی ہے؟' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مجھے اونچی آواز سے اور قدرے آگے جھک کر بولنا پڑ رہا تھا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ٹریفک اور رکشے کے اپنے شور کے باوجود اسے رخ موڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔

'دل ٹوٹا ہے، یہ تو کنفَرم ہے، یارے!' اس نے انگریزی لفظ 'کنفرم' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ 'باقی اگر محبوبہ کا منع کرتے، تو نوکری کا پوچھتا، وہ منع کرتے تو کچھ اور۔۔۔'

میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ وہ بھی دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس کے شانے اور بھی لہک رہے تھے۔ فلائی اوور سے گزرتی سڑک اب پی۔آئی۔بی کالونی کی جانب مڑ گئی تھی۔

'اچھا کچھ بتا کر بھی گئی یا ایسے ہی چلی گئی۔۔۔؟' رکشے والے نے کہا۔

'۔۔۔ بتا کر تو بہت کچھ گئی تھی لیکن اسے کیا بتاتا۔۔۔'

رکشے والا خاموش رہا، جیسے منتظر ہو میں کچھ کہوں۔

'میری کہانی عام ڈراموں، فلموں والی نہیں ہے۔۔۔' میں نے بالآخر کہنا شروع کیا۔ 'بس یوں سمجھو اسے وہ مشہور مصرع سنا دیا ؎ میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے۔'

'سنا ہوا لگ رہا ہے۔' رکشے والے نے کہا۔

'ہاں، یہ مصرع بلکہ پوری نظم ایک زمانے میں خاصی مشہور ہوئی تھی، تاج محل کے نام سے۔'

'تاج محل۔۔۔ انڈیا والا!'

'ہاں، وہی تاج محل۔ ساحر لدھیانوی کی نظم ہے۔'

'ھوں ں ں۔۔۔ یعنی تیرا شاعر محبوبہ سے کہہ رہا ہے کہ تاج محل کی جگہ کہیں اور ملا کر!' رکشے والا نے کہا۔

'ہاں یہی!' میں نے کہا۔

'پوری نظم میں کیا تھا؟' رکشے والے نے کچھ لمحوں بعد کہا۔

'پوری نظم میں۔۔۔؟'

'ہاں، کیا تھا؟' رکشے والے کے لہجے میں انہماک تھا۔

میں نے کچھ لحظے سوچا کہ مختصراً کیسے بتاؤں۔ پھر کہنا شروع کیا،

'اس نظم میں شاعر اپنی محبوبہ سے مخاطب ہے۔ اس کی محبوبہ کو تاج محل سے بڑی عقیدت ہے۔ جیسے تاج محل کی ظاہری شان و شوکت اور خوبصورتی، محبت کی سچائی اور بلندی کی سند ہو اور تاج محل کو اس لائق بنا دیتی ہو کہ دوسرے محبت کرنے والوں کی زیارت گاہ بن جائے۔'

'ہاں، تاج محل اسی لیے تو مشہور ہے۔' رکشے والے نے کہا۔

'ہاں، لیکن ہمارا شاعر صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا۔ اسے اس ظاہری شان و شوکت اور خوبصورتی کے پیچھے غریبوں، محکوموں کا ناحق بہنے والا خون پسینہ دکھائی دیتا ہے۔ اس لیے وہ تاج محل کو اپنی پاکیزہ محبت کے لائق نہیں سمجھتا۔ اور وہ اپنی محبوبہ سے یہ سوال بھی کرتا ہے کہ اُن غریبوں، محکوموں کا بھی دل تھا، ان کے بھی جذبات تھے، کیا ان کی محبت اس لائق نہیں تھی کہ یاد کیا جاتا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر

ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے'

'ھوں ں ں ---' رکشے والے کے منہ سے نکلا۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا، جیسے کسی گہری سوچ میں پڑ گیا ہو۔

رکشا میرے محلّے تک پہنچ گیا تھا۔ میں ہاتھ کے اشارے سے اسے محلّے کے اندرونی راستوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ وہ رکشے کو اسی کے مطابق گلیوں میں گھما رہا تھا۔

پھر جیسے رکشے والا اپنی گہری سوچ سے باہر نکلا اور کہنے لگا،

'پیارے، بات تو تیرے شاعر نے بڑی سَالِڈ کی ہے۔ پر اُس نے--- کیا نام تھا اس کا---؟'

'ساحر--- ساحر لدھیانوی کے نام سے مشہور تھا۔'

'ہاں--- اس نے اپنی نظم میں یہ بتایا کہ اگر محبوبہ پھر بھی نہ مانے تو کیا کرو؟'

'نہیں--- یہ اس نے نہیں بتایا۔' میں نے ایک گہری سانس لی۔

'--- ستم تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کہی، پھر بھی نازو فردِ جرم عائد کرکے، ہمارے برسوں کے رشتے کو یوں منٹوں میں توڑ کر چلی گئی---'

میری گلی آ گئی تھی۔ میں نے اسے ایک چھوٹے سے دو منزلہ مکان کے سامنے رکشا روکنے کو کہا۔ مکان کی اوپری منزل پر، دو کمروں پر مشتمل کرائے کے ایک فلیٹ میں میرا بسیرا تھا۔ گراؤنڈ فلور آج کل خالی تھا۔

'پروفیسر، ویسر ہو؟' رکشا کے رکتے ہی اس نے کہا۔

'تم کیسے کہہ سکتے ہو؟' میں نے پوچھا۔

'۔۔۔ یہ رکشے والے سڑکوں کے ساتھ ساتھ شاید مسافروں کو بھی پڑھنے کے ماہر ہو جاتے ہیں۔ یا شاید یہی کچھ انوکھا ہے۔۔۔'

'پیارے، اس گرمی میں کوٹ پہنا ہوا ہے۔' رکشے والا نے کہا۔ 'صحافی یا وکیل ہوتے تو موٹر سائیکل تو رکھتے۔ پی۔آئی۔بی کالونی میں بھی اس جگہ رہتے ہو۔ ذہن اچھا ہے، پر پیسے بنانے کی دوڑ میں نہیں ہو۔ اور سمجھاتے بھی استادوں کی طرح ہو۔'

اس کے مشاہدے کا انداز دلچسپ تھا۔

'دوست، یونیورسٹی میں لیکچرار ہوں، تمھارا اندازہ اس حد تک درست ہے۔' میں نے جواب میں کہا۔ 'مگر دیکھو، پروفیسر لوگ بھی پیسے بنانے کی دوڑ میں لگ سکتے ہیں۔ بس کس کو کب، کہاں، اور کتنا موقع ملتا ہے، سانپ سیڑھی کا امتحان یہاں ہوتا ہے۔ کسی کی گوٹ پیسے میں پھنستی ہے، کسی کی طاقت میں، کسی کی شہرت میں، کسی کی کہیں اور۔'

میں یہ کہہ کر رکشے سے اترنے لگا۔ وہ بھی رکشے سے نکل آیا۔

'پیارے! تیرے شاعر نے مسئلہ بتا دیا، پر حل میرے رکشے کا شاعر بتائے گا!' رکشے والے نے کہا۔

'وہ کیا؟' میرے منہ سے نکلا۔

'آ اِدھر دیکھ! آ بتاؤں تجھے کہ دل ٹوٹتا ہے تو نئی راہیں بھی پھوٹتی ہیں!'

وہ مجھے اپنے رکشے کے عقب میں لے گیا۔ گلی میں روشنی ناکافی تھی۔ اس نے اپنے موبائل فون کی ٹارچ کو روشن کیا۔

'آہا۔۔!' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ میں مسکرا رہا تھا۔ رکشے کے پیچھے ایک مصرعے کو دو سطروں میں لکھا گیا تھا:

تو نہیں اور سہی

اور نہیں اور سہی

یہ مصرع بلکہ پورا شعر پہلے سنا ہوا تھا۔ مگر یہاں ایک خاص مناسبت محسوس ہو رہی تھی۔ اس انوکھے انجانے کے ساتھ بات کرلینے سے دل یوں بہل جائے گا، کیا خبر تھی!

لیکن میری نظریں رکشے کے پیچھے سے نہیں ہٹیں۔ سوچ رہا تھا کہ نازو کوئی عام لڑکی تو نہیں کہ کوئی بھی اس کی جگہ لے لے۔ وہ دل کوئی اور ہوگا جو اسے اتنی آسانی سے بھلا دے۔

امتحانی سوالات

(لازمی پرچہ)

نوٹ: دیے گئے سوالات پر اچھی طرح غور کرو اور سکون سے جواب دو۔ جب چاہو سبق کھول کر دیکھ لو!

حصّہ اول

۱) تم عرضی لکھنے میں کن آداب کا خیال رکھو گے؟ 'عرضی' ہی لکھو گے یا 'خط' لکھو گے؟ اور جو بھی لکھو گے اسے کوئی کیوں لفٹ کرائے گا؟

۲) فرض کرو تم ایک 'پروفیشنل' ہو اور تم سے کہا جائے کہ کسی غیر سنجیدہ یا گمراہ کُن بات کو بڑی خبر بنا دو، تو تم کیسی ہیڈ لائن ڈالو گے؟ کوئی سوال اٹھا کر چھوڑ دو گے؟ کسی کے متنازع بیان کو نقل کر دو گے؟ چار لوگوں میں سَروے کروا کر اُسے 'عوام کی آواز' کے طور پر پیش کر دو گے؟ لفظوں کا کھیل کھیلو گے؟ یا کوئی اور ترکیب لڑاؤ گے؟

۳) کیا تم نے بھی آگے جانا ہے؟ یا جہاں ہو وہیں ٹھیک ہو؟ یا کچھ اور ارادہ ہے؟ تمام صورتوں میں بتاؤ، اس سے دوسروں کو کیا فرق پڑے گا؟ تجزیہ گہرا ہونا چاہیے!

۴) کیا تمہیں کبھی باس شاہی سونگھنی پڑی ہے؟ یا روز ہی سونگھنے کو ملتی ہے؟ تمہارے خیال میں باس شاہی سنگھانے کا نشہ ہمارے معاشرے میں کیوں اس قدر پھیلا ہوا ہے؟ کیا مسئلہ صرف سسٹم کا ہے؟

۵) انسان کو سمجھنے کے لیے مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً انسان کی ایک تعریف 'حیوانِ ناطق' کے طور پر کی گئی ہے، یعنی وہ حیوان جو بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کچھ

لوگ حیوانِ ناطق کا ترجمہ، شعور و عقل کے حامل حیوان کے طور پر کرتے ہیں۔ انسان کی تعریف بحیثیتِ 'سماجی حیوان' اور 'سیاسی حیوان' کے طور پر بھی کی گئی ہے۔ تمہارا ان تعریفوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا یہ پورے انسان کو دیکھ پاتی ہیں؟ کیا یہ انسانی وجود کی گہرائیوں کا احاطہ کر پاتی ہیں؟ یا ان تعریفوں کا مقصود انسانی حقیقت کا احاطہ کرنا نہیں ہوتا، صرف اشارہ کرنا ہوتا ہے اور 'بنی نوع انسان' کو دوسروں سے جداگانہ انداز میں دیکھنا ہوتا ہے؟ اچھا یہ بتاؤ اگر تم انسان کی تعریف کرو تو کیسے کرو گے؟

حصّہ دوم

۱) کتاب میں دیے گئے اسباق کو سامنے رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل شعر پر اظہارِ خیال کرو! چاہو تو ایک اچھی سی کہانی بھی لکھ ڈالو!

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب / اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

(میر تقی میرؔ)

۲) تمہیں اپنے بچپن میں سنی ہوئی کون کون سی کہانیاں اب بھی یاد ہیں؟ کیا تم وہ ساری کہانیاں اپنے چھوٹوں کو بھی سناؤ گے؟ کیا بچّوں کی ساری کہانیاں معصوم اور بے ضرر ہوتی ہیں؟

۳) کیا تم تعلیم کے ذریعے صرف کسی پیشے کو چنو گے یا پورا انسان بننے کی کوشش کرو گے؟ اچھا یہ بتاؤ پورا انسان بننے کے لیے کیسی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے؟

۴) دائمی ترقی پذیر رہنے کے فوائد پر روشنی ڈالو۔ بلکہ روشنی ڈالنے کے لیے بھی باہر سے امداد مل سکے، اس کی بھی کوئی ترکیب نکالو!

۵) تم کس حد تک اتفاق کرو گے کہ ہم نے نمبروں کی حدود کا تعین نہیں کیا اور اب نمبروں نے ہمیں، ہمارے معاشروں کو جیسے کولونائز کر لیا ہے؟ تمھارے خیال میں کیا اے۔آئی کے معاملے میں بھی یہی ہو رہا ہے؟

حصّہ سوم

۱) انٹرنیٹ سے ایک کو۔آن نما قول ملا جو عبارت اور مفہوم کے لحاظ سے کئی لوگوں سے منسوب ہے۔ دانائی کا قول ہے اس لیے خوب غور کرو! چاہو تو ایک اچھی سی کہانی بھی لکھ ڈالو! کو۔آن کچھ یوں ہے:

'کچھ لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ سوائے پیسے کے اُن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔'

۲) یہ بتاؤ پرانے زمانے میں جو لوگ فلسفہ و حکمت کے استاد ہوتے تھے انھیں حکیم کیوں کہا جاتا تھا، حالانکہ ان میں سے ہر کوئی اپنا مطب نہیں کرتا تھا؟

۳) تم خبروں، اشتہاروں، اور سیاسی بیانات وغیرہ کو سنتے ہو تو کون کون سے منطِقی مغالطوں کو عموماً نوٹ کرتے ہو؟ وقت ملے تو اسباق میں دی گئی اقسام کے علاوہ، کچھ مزید اقسام کو معتبر ذرائع سے تلاش کرو۔ پھر تناظر اور مضمرات کو سامنے رکھتے ہوئے میاں جی کو سمجھانے کی کوشش کرو! مزید دلچسپی ہو تو سید محمد باقر الصدر اور اسٹیفن ٹولِمن[۸۹] کے منطِقی استدلال پر مباحث کو دیکھ ڈالو!

۴) تم 'افسانے' کی تعریف کیسے کرو گے؟ اگر تم سے کہا جائے کہ افسانہ لکھو تو کیسے لکھو گے؟ کیا پلاٹ ہوگا، کیا اسلوب ہوگا، کس کے لیے لکھو گے، کیا سوچ کر لکھو گے؟ چاہو تو بس ایک مختصر سا افسانہ لکھ ڈالو!

---

[۸۹] Stephen Toulmin

۵) فیضؔ احمد فیضؔ کی کچھ نظمیں خاصی مشہور ہیں، مثلاً 'بول کہ لب آزاد ہیں تیرے' اور 'و یبقٰی وجہ ربک'۔ یہ بتاؤ کیا ہر پڑھنے والے کے ساتھ ساتھ ان نظموں کے مفہوم اور تعبیریں بھی بدل جاتی ہیں؟ کیا ان نظموں کے تاریخی و سماجی پس منظر کو جاننے یا نہ جاننے سے کوئی فرق پڑتا ہے؟ یہ بھی بتاؤ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ اب ان انقلابی نظموں کو کولا کورپوریشنز گا گا کر عوام تک پہنچا رہی ہیں؟

<u>بونس سوال</u>: جوشؔ سے منسوب مندرجہ ذیل شعر پر ذرا غور کرو اور دیے گئے سوال پر اظہارِ خیال کرو:

اب بوے گل نہ بادِ صبا مانگتے ہیں لوگ / وہ حبس ہے کہ لُو کی دعا مانگتے ہیں لوگ

(جوشؔ ملیح آبادی)

یہ بتاؤ حبس کتنی بڑھائی جائے تو لوگ لُو پر بھی راضی ہوجاتے ہیں، بلکہ خود ہی لُو کی دعا بھی مانگنے لگتے ہیں؟

اب چاہو تو اس کتاب میں دیے گئے ہر سبق سے متعلق نئے سوالات بنا لو اور آپس میں ڈسکس کرو۔ پھر خود ہی اپنے آپ کو 'نمبر' بھی دے ڈالو! کسی سبق یا پوری کتاب کے بارے میں کوئی تعمیری رائے ہو تو ضرور شیئر کرو!

گزارشات

خواہش تھی کہ کچھ حکایتیں، کچھ باتیں، کچھ اشارے، جنھیں ایک عرصہ لگا کر جمع کیا اور جن پر زندگی کے تجربات نے بارہا سوچنے کا موقع دیا، انھیں یہاں کہانیوں کی صورت میں بیان کر دیا جائے۔ کیوں کہ کہانیاں یاد رہ جاتی ہیں اور شاید اس طرح یہ باتیں منتقل ہوجائیں۔ البتہ تخلیقی عمل خود بھی سیکھنے اور اِنسپریشن کا سبب بنتا ہے۔ اس کتاب کے تخلیقی کینوس پر کام کرتے ہوئے بھی بہت سے ایسے مطالب روشن ہوئے جو پہلے نگاہوں کے سامنے نہ تھے۔

اس بات کی بھی وضاحت ہوجائے کہ اس کتاب میں تنقید کو محض نکتہ چینی کے معنی میں نہیں لیا گیا ہے۔ بلکہ تنقید کو نَقْد کرنا کے معنی میں سمجھا گیا ہے، یعنی کھرا کھوٹا پہچاننا، جانچنا، کسوٹی پر پرکھنا، تصدیق کرنا، وغیرہ۔ امید ہے یہ کتاب تنقیدی اور تخلیقی طرز فکر کے فروغ کی کوششوں میں معاون ہوگی۔

کتاب کے ریویو کے لیے بہت سے احباب کا تعاون شامل رہا، میں ان سب کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ کتاب میں موجود معروضات اور فروگزاشت کی تمام تر ذمّہ داری راقم کی ہے۔ اپنی تعمیری آرا ہماری ویب سائٹ اور سوشل میڈیا وغیرہ کے ذریعے ضرور شیئر کیجیے گا۔

نیک خواہشات کے ساتھ

ڈاکٹر عون علی

دسمبر ۲۰۲۴

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

غالبؔ